ALLAMA IQBAL LIBRARY

UNIVERSITY OF KASHMIR

Acc. No. ______ *Call No.* ______

1. This book should be returned on or before the last d[ate] stamped.
2. Overdue charges will be levied under rules for each [day] if the book is kept beyond the date stamped above.
3. Books lost, defaced or injured in any way shall have [to] be replaced by the borrower.

کلیات

فیض احمد فیض

cados

U1
E147 K

مقدمہ: پروفیسر آل احمد سرور (۱۵)

چھُٹے چھُٹے

ملاقات

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے، کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نور، رو گئے ہیں

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتّے

○

زنداں نامہ: (۱۹۵۶ء)

دستِ تہِ سنگ : (۱۹۶۴ء)

مقدمہ

رابرٹ فراسٹ نے اپنی ایک نظم میں بڑے پتے کی بات کہی ہے "میرا اور دنیا کا جھگڑا دو پریمیوں کا جھگڑا ہے"۔ شاعر زندگی سے محبت کرتا ہے اور کبھی کبھی زندگی کے ایک بلند تصور کی خاطر اس کے سستے اور کاروباری تصور سے لڑتا ہے
شاعر کے خواب محض خیالی دنیا کی پرچھائیاں نہیں ہوتے، ان میں ایک گہری اور 15
تابندہ حقیقت کی کرن ہوتی ہے اس کرن کی خاطر وہ ظلمات سے ہی نہیں سورج سے بھی لڑنے کو تیار رہتا ہے۔ زندگی کی بصیرت اور ایک دردمند دل، یہی شاعر کی دولت ہیں۔ یہ بصیرت فطرت سے ملتی ہے مگر اس پر جلا زندگی کے سوز و ساز اور درد و داغ سے ہوتی ہے میر نے خوب کہا ہے:

اے آہوانِ کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد
کھاؤ کسی کا تیر کسی کے شکار ہو

کعبے کی فضیلت آہوانِ کعبہ سے نہیں بلکہ ان سے ہے جو اس کے زخم خوردہ ہیں، جنھیں زندگی اور اس کے حسن سے محبت ہے وہ ہر بدصورتی، تاریکی، سنگدلی،

پستی اور بے انصافی سے برسرِ پیکار ہوتے ہیں ایک تو حسن کے ترانے گا کر وہ کم بینوں کو نظر، پتھر کو دل اور دل کو گداز عطا کرتے ہیں، ان میں ذوقِ جمال پیدا کرتے ہیں ان کو تناسب، موزونیت اور ترتیب و تہذیب سے آشنا کرتے ہیں اُن کی روحانی پیاس بجھاتے ہیں، دوسرے اس کے سہارے انھیں خود غرضی، جنگ جوئی، نفرت، حسد، بے حسی اور جہالت کے خلاف نبرد آزما کرتے ہیں۔ شاعر کے نغمے سے سبھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مگر سُرور مے میں نالۂ نَے نشتّر میں تلخی اور تبسّم میں زخموں کی کائنات پر لوگوں کی نظر نہیں جاتی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک یونانی دیوتا کے ناسور سے سب عاجز تھے مگر اس کی قادر اندازی کی وجہ سے اس سے بے نیاز بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لیے شاعر کے نغموں پر سر دھننے والوں کو اس کے دل کے 16
داغوں کی بھی جستجو کرنی چاہیے اس کے بغیر وہ نہ ان کے داغوں کے چراغوں سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور نہ اس چراغاں کی سیر کا صحیح معنی میں انہیں حق پہنچتا ہے۔ اپنے زخموں سے دوسروں کے دلوں میں پھول کھلانا اور اپنے داغوں سے عالم میں چراغاں کرنا شاعر کا زندگی پر بہت بڑا احسان ہے۔

فیضؔ ہمارے ایسے ہی شاعروں میں سے ہیں جنھیں زندگی اور اس کے ہزار شیوہ حسن سے محبت ہے اور اس محبّت کی وجہ سے ان کا اور زندگی کا جھگڑا بھی چلا جاتا ہے۔ فیضؔ کو آتش خانوں کی مقدس آنچ ملی ہے مگر اس نے انھیں جھلسایا نہیں، بلکہ ان کی شخصیت کو توانائی اور ان کی شاعری کو تب و تاب عطا کی ہے۔

فیض نے اپنی چنگاری پر اکتفا نہیں کیا اسے ہوائے رہگزر سے دہکایا اور اس سے ایک شمع کا کام لیا ہے۔ انھوں نے ایک طرف مشرقی اور مغربی ادب کے خزانوں سے فیض اٹھایا اور حسن کاری کے کتنے ہی اسلوب اور "عبارت اشارت اور ادا" کے کتنے ہی ڈھنگ، جذب کیے، دوسری طرف انھوں نے ہر وادی خیال کو مستانہ طے کرنے اور جگر کی طرح یہ کہنے پر قناعت نہیں کی۔

فکرِ منزل ہے نہ ہوش جادۂ منزل مجھے
جا رہا ہوں جس طرف لے جا رہا ہے دل مجھے

بلکہ آگہی سے عشق کیا اور منزل اور جادۂ منزل کے عرفان کی بھی سعی کی، دوسرے الفاظ میں فیض محض واردات قلب کے شاعر نہیں ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ زندگی ۱۷
کے ایک سنجیدہ شعور کی توانائی میں وارداتِ قلب کی گرمی اور گداز پیدا کرتے ہیں۔ آئی، اے رچرڈس کے نزدیک شاعرانہ حقیقت مادی حقیقت سے الگ اپنا ایک وجود رکھتی ہے۔ اقبال نے یہ ثابت کر دیا کہ جب شاعری مادّی حقائق سے غذا حاصل کرے تو اس کی توانائی کس درجے کی ہوتی ہے۔ فیض کے یہاں یہ توانائی حسن بن کر آتی ہے، کہا جاتا ہے کہ ایک ضرب کلیمی سے پتھر کے سینے سے طوفان جاری ہو جاتا تھا۔ فیض نے زندگی کی صداقتوں سے جو نغمگی حاصل کی ہے وہ جدید شاعری میں اپنی مثال آپ ہے۔ مجاز کی طرح اور مجاز سے بہتر طور پر انقلاب کے نغمے فیض نے گائے ہیں۔ یہ نغمگی فیض میں کہاں سے آئی۔ زندگی کے عرفان سے، ارتقا اور انسانیت پہ

ایمان سے، ایک بہتر زندگی کے جہاد میں تن من دھن سے حصہ لینے سے، اپنے خوابوں کی خاطر سنتے حقایق سے نبرد آزما ہونے سے، حسن کے اداشناس ہونے کی وجہ سے، پھر ایک کنجوس کی طرح اپنے علم کی دولت کی حفاظت کے بجائے اُسے لٹانے اور ٹھکانے لگانے کی آرزو کی وجہ سے، اچھے مقاصد کی لگن اور سعی پیہم کی حرارت سے، سستانے اور تھک کر بیٹھ جانے کے بجائے گرم طلب رہنے سے۔

اس سے ان کی شاعری میں رجائیت، زندگی پر اعتماد اور قوتِ شفا آئی۔ میں شاعری کی بصیرت کو مانتا ہوں مگر فراسٹ کی طرح اس شاعری کا قایل ہوں جو پہلے مسّرت اور پھر بصیرت عطا کرے۔ محض بصیرت کی دعوت میں کشش نہیں ہوتی، ہاں مسّرت کی تلاش عام ہے۔ جو مسرت کو بصیرت بھی عطا کردے وہی سچّا شاعر ہے۔ آگ ڈھونڈنے والوں کو پیمبری بھی مل جائے تو کیا کہنا۔ فیض کی حسن کاری، اس کی شیرینی، اس کی نغمگی ہمیں سُلاتی نہیں، جھنجھوڑتی بھی نہیں، یہ بڑی سادہ و پرکار ہے۔ یہ چپکے چپکے ہمیں ایک خاموش عزم عطا کرتی ہے۔ یہ ہمیں زندگی سے محبت کرنا سکھاتی ہے اور اس محبت کو ایک فضیلت اور اس کی خاطر جہاد کو ایک عبادت سمجھنے کا ولولہ دیتی ہے۔

پھر فیض کی لے میں بڑی کشش ہے اس میں ہماری پرانی شاعری کی رچی ہوئی کیفیت نہیں، مگر ایک نیا رچاؤ ہے جس میں انگریزی ادب کے ایک خوشگوار اثر،

جدید انسان کے ذہن اور ایشیائی تہذیب کے قابلِ قدر عناصر کی ایک قوس قزح جلوہ گر ہے۔ فیض کی شاعری DIRECT کم OBLIQUE زیادہ ہے وہ صراحت کے نہیں رمز کے شاعر ہیں مگر اس کے باوجود ان کا ذہن اتنا مرتب اور فنی شعور اس قدر تربیت یافتہ ہے کہ وہ نہایت واضح طور پر اپنی بات کہہ دیتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ فیض اپنا ایک الگ اسلوب رکھتے ہیں، جس میں کتنے ہی اُردو اور انگریزی شعرا کی گونج سنائی دیتی ہے مگر آواز ان کی اپنی ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ ہمارے اس باشعور اور صاحبِ طرز شاعر کی روداد اور افتاد ہی نہیں عصرِ حاضر کی اس زخمی روح کی پُرسوز اور پُرکار لَے بھی ہے جس کے اثر سے زندگی کا حُسن کچھ اور نکھر جاتا ہے اور انسانیت اور تہذیب پر ایمان کچھ اور تازہ ہو جاتا ہے۔ 19

آل احمد سرور

انجمن ترقی اردو ہند

علی گڑھ

فیض از فیض

اپنے بارے میں باتیں کرنے سے مجھے سخت وحشت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ سب بور لوگوں کا مرغوب شغل یہی ہے، اس انگریزی لفظ کے لیے معذرت چاہتا ہوں لیکن اب تو ہمارے ہاں اس کے مشتقات بوریت وغیرہ بھی استعمال میں آنے لگے ہیں۔ اس لیے اب اسے اُردو روزمرہ میں شامل سمجھنا چاہیے۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے اپنے بارے میں قیل و قال بری لگتی ہے۔ بلکہ میں تو شعر میں بھی حتی الامکان واحد متکلم کا صیغہ استعمال نہیں کرتا، اور 'میں' کے بجائے ہمیشہ سے 'ہم' لکھتا آیا ہوں چنانچہ جب ادبی سراغرسان حضرات مجھ سے یہ پوچھنے بیٹھتے ہیں کہ تم شعر کیوں کہتے ہو کیسے کہتے ہو اور کس لیے کہتے ہو تو بات کو ٹالنے کے لیے جو دل میں آئے کہہ دیتا ہوں مثلاً یہ کہ بھئی میں جیسے بھی کہتا ہوں جس لیے کہتا ہوں تم شعر میں خود ڈھونڈ لو میرا سر کھانے کی کیا ضرورت ہے لیکن ان میں سے ڈھیٹ قسم کے لوگ جب بھی نہیں مانتے۔ چنانچہ آج کی گفتگو کی سب ذمہ داری ان حضرات کے سر ہے مجھ پر نہیں۔

شعر گوئی کا کوئی واحد عذرِ گناہ تو مجھے نہیں معلوم اس میں بچپن کی فضائے

گرد و پیش میں شعر کا چرچا، دوست احباب کی ترغیب اور دل کی لگی سبھی کچھ شامل ہے۔ یہ نقشِ فریادی کے پہلے حصے کی بات ہے جس میں ۱۹۲۸ء سے ۳۵-۱۹۳۴ء تک کی تحریریں شامل ہیں جو ہماری طالب علمی کے دن تھے، یوں تو ان سب اشعار کا قریب قریب ایک ہی ذہنی اور جذباتی واردات سے تعلّق ہے اور اس واردات کا ظاہری محرک تو وہی ایک حادثہ ہے جو اس عمر میں اکثر نوجوان دلوں پر گزر جایا کرتا ہے۔ لیکن اب جو دیکھتا ہوں تو یہ دَور بھی ایک دور نہیں تھا۔ بلکہ اس کے بھی دو الگ الگ حصے تھے جن کی داخلی اور خارجی کیفیت کافی مختلف تھی۔ وہ یوں ہے کہ ۲۰ء سے ۳۰ء تک کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی اور سماجی طور سے کچھ عجب طرح کی بے فکری آسودگی اور ولولہ انگیزی کا زمانہ تھا جس میں اہم قومی اور سیاسی تحریکوں کے ساتھ ساتھ نثر و نظم میں بیشتر سنجیدہ فکر و مشاہدہ کے بجائے کچھ رنگ رلیاں منانے کا سا انداز تھا۔ شعر میں اوّلاً حسرت موہانی اور ان کے بعد جوش، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کی ریاست قائم تھی افسانے میں یلدرم اور تنقید میں حسن برائے حسن اور ادب برائے ادب کا چرچا تھا۔ "نقشِ فریادی" کی ابتدائی نظمیں، خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو، مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو، تہ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں، وغیرہ وغیرہ اسی ماحول کے زیر اثر مرتب ہوئیں اور اس فضا میں ابتدائے عشق کا تحیر بھی شامل تھا لیکن ہم لوگ

اس دور کی ایک جھلک بھی ٹھیک سے نہ دیکھ پائے تھے کہ صحبتِ یار آخر شد۔
پھر دیس پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے کالج کے
بڑے بڑے بانکے تیس مار خاں تلاشِ معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے،
یہ وہ دن تھے جب یکایک بچوں کی ہنسی بجھ گئی، اُجڑے ہوئے کسان کھیت
کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے اور اچھی خاصی شریف بہو
بیٹیاں بازار میں آ بیٹھیں۔ گھر کے باہر یہ حال تھا اور گھر کے اندر مرگِ
سوزِ محبت کا کہرام مچا تھا، یکایک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر سبھی
راستے بند ہو گئے ہیں اور اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا، اس
 کیفیت کا اختتام جو 'نقشِ فریادی' کے پہلے حصے کی آخری نظموں کی کیفیت
ہے۔ ایک نسبتاً غیر معروف نظم پر ہوتا ہے جسے میں نے "یاس" کا نام دیا تھا

۳۴ء میں ہم لوگ کالج سے فارغ ہوئے اور ۳۵ء میں میں نے ایم اے
او کالج امرتسر میں ملازمت کر لی، یہاں سے میری اور میرے بہت سے ہم عصر لکھنے
والوں کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے اس دوران کالج میں
اپنے رُفقا صاحبزادہ محمود الظفر مرحوم اور ان کی بیگم رشید جہاں سے
ملاقات ہوئی۔ پھر ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی، مزدور تحریکوں کا
سلسلہ شروع ہوا اور یوں لگا کہ جیسے گلشن میں ایک نہیں کئی دبستان کُھل
گئے ہیں۔ اس دبستاں میں سب سے پہلا سبق جو ہم نے سیکھا یہ تھا کہ اپنی

ذات کو باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا اوّل تو ممکن ہی نہیں اس لیے کہ اس میں بہرحال گرد و پیش کے سبھی تجربات شامل ہوتے ہیں اور اگر ایسا ممکن ہو بھی تو انتہائی غیر سود مند فعل ہے کہ ایک انسانی فرد کی ذات اپنی سب محبتوں اور کدورتوں مسرتوں اور رنجشوں کے باوجود بہت ہی چھوٹی سی بہت ہی محدود اور حقیر شے ہے۔ اس کی وسعت اور پہنائی کا پیمانہ تو باقی عالم موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں، خاص طور سے انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کے رشتے، چنانچہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں تو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں اس نئے احساس کی ابتدا نقش فریادی کے دوسرے حصّے کی پہلی نظم سے ہوتی ہے اس نظم کا عنوان ہے: "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" اور اگر آپ ۲۳
خاتون ہیں تو "مرے محبوب نہ مانگ"۔

اس کے بعد تیرہ چودہ برس "کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں" میں گزرے اور پھر فوج، صحافت ٹریڈ یونین وغیرہ وغیرہ کے بعد ہم چار برس کے لیے جیل خانے چلے گئے، نقشِ فریادی کے بعد کی دو کتابیں 'دستِ صبا' اور 'زنداں نامہ'، اسی جیل خانے کی یادگار ہیں بنیادی طور سے تو یہ تحریریں انہی ذہنی محسوسات اور معمولات سے منسلک ہیں جن کا سلسلہ "مجھ سے پہلی سی محبت" سے شروع ہوا تھا لیکن جیل خانہ عاشقی کی طرح خود ایک بنیادی تجربہ ہے جس میں فکر و نظر کا ایک آدھ نیا دریچہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ چنانچہ اوّل تو

چھپتے چھپتے

یہ ہے کہ ابتدائے شباب کی طرح تمام حسیّات یعنی SENSATIONS پھر تیز ہو جاتی ہیں اور صبح کی پَو، شام کے دھندلکے، آسمان کی نیلاہٹ، ہوا کے گداز کے بارے میں وہی پہلا سا تحیر لوٹ آتا ہے دوسرے یوں ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کا وقت اور فاصلے دونوں باطل ہو جاتے ہیں، نزدیک کی چیزیں بھی بہت دور ہو جاتی ہیں اور دُور کی نزدیک اور فرداودی کا تفرقہ کچھ اس طور سے مٹ جاتا ہے کہ کبھی ایک لمحہ قیامت معلوم ہوتا ہے اور کبھی ایک صدی کل کی بات، تیسری بات یہ ہے کہ فراغتِ ہجراں میں فکر و مطالعہ کے ساتھ عروسِ سخن کے ظاہری بناؤ سنگھار پر توجہ دینے کی زیادہ مہلت ملتی ہے اس جیل خانے کے بھی دو دور تھے۔ ایک حیدرآباد جیل کا جو اس تجربے کے انکشاف کے تحیر کا زمانہ تھا۔ ایک منٹگمری جیل کا جو اس تجربے سے اکتاہٹ اور تھکن کا زمانہ تھا ان دو کیفیتوں کی نمائندہ دو نظمیں ہیں، زنداں کی ایک شام اور اے روشنیوں کے شہر پہلی دستِ صبا میں، دوسری زنداں نامہ میں۔ 26

زنداں نامے کا زمانہ کچھ ذہنی افراتفری کا زمانہ ہے جس میں اپنا اخباری پیشہ چھٹا، ایک بار پھر جیل خانے گئے، مارشل لا کا دور آیا، اور ذہنی اور گرد و پیش کی فضا میں پھر سے کچھ انسداد راہ اور کچھ نئی راہوں کی طلب کا احساس پیدا ہوا، اس سکوت اور انتظار کی آئینہ دار ایک نظم ہے "شام" اور ایک نامکمل غزل کے چند اشعار ہیں:

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہو گی

آج کے نام

اور آج کے غم کے نام

کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام
کرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام
پوسٹ مینوں کے نام
تانگے والوں کے نام
ریل بانوں کے نام
کارخانوں کے بھوکے جیالوں کے نام
بادشاہِ جہاں، والیِ ماسوا، نائب اللہ فی الارض،
دہقاں کے نام
جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے ہیں،
جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے ہیں

ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی ہے
دوسری مالیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی ہے
جس کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے
دھجیاں ہو گئی ہے،
اُن دُکھی ماؤں کے نام
رات میں جن کے بچّے بلکتے ہیں اور
نیند کی مار کھاتے ہوئے بازوؤں سے سنبھلتے نہیں
دکھ بتاتے نہیں
منّتوں زاریوں سے بہلتے نہیں

○

اُن حسیناؤں کے نام
جن کی آنکھوں کے گُل
چلمنوں اور دریچوں کی بیلوں پہ بیکار کھِل کھِل کے مرجھا گئے ہیں
اُن بیاہتاؤں کے نام
جن کے بدن بے محبت ریاکار سیجوں پہ سج سج کے اکتا گئے ہیں،

بیواؤں کے نام
کٹڑیوں اور گلیوں، محلّوں کے نام،
جن کی ناپاک خاشاک سے چاند آ آ کے
راتوں کو کرتا ہے اکثر وضو
جن کی غاروں میں کرتی ہے آہ و بکا
آنچلوں کی حنا
چوڑیوں کی کھنک،
کاکلوں کی مہک
آرزومند سینوں کی اپنے پسینے میں جلنے کی بُو،
طالبعلموں کے نام
وہ جو اصحاب طبل و علم
کے دروں پر کتاب اور قلم
کا تقاضا لیے، ہاتھ پھیلائے
پہنچے، مگر لوٹ کر گھر نہ آئے
وہ معصوم جو بھولپن میں

وہاں اپنے ننھے چراغوں میں لو کی لگن
لے کے پہنچے جہاں
بٹ رہے تھے، گھٹا ٹوپ بے انت راتوں کے سائے،
ان اسیروں کے نام
جن کے سینوں میں فردا کے شب تاب گوہر
جیل خانوں کی شوریدہ راتوں کی صرصر میں
جل جل کے انجم نما ہو گئے ہیں،
آنے والے دنوں کے سفیروں کے نام
وہ جو خوشبوئے گُل کی طرح
اپنے پیغام پر خود فدا ہو گئے ہیں۔

○

دیدۂ تر پہ وہاں کون نظر کرتا ہے
شیشۂ چشم میں خونابِ جگر لے کے چلو
اب اگر جاؤ پئے عرض و طلب اُن کے حضور
دست و کشکول نہیں، کاسۂ سر لے کے چلو

○

زنداں زنداں شورِ انا الحق، محفل محفل قُلقُلِ مے
خونِ تمنّا دریا دریا، دریا دریا عیش کی لہر
دامن دامن رُت پھولوں کی، آنچل آنچل اشکوں کی
قریہ قریہ جشن بپا ہے، ماتم شہر بشہر

یتیم لہو

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سُراغ
نہ دست و ناخنِ قاتل نہ آستیں پہ نشاں
نہ سرخیٔ لبِ خنجر نہ رنگِ نوکِ سناں
نہ خاک پر کوئی دھبّہ نہ بام پر کوئی داغ
کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ صرفِ خدمتِ شاہاں کہ خوں بہا دیتے
نہ دیں کی نذر کہ بیعانۂ جزا دیتے
نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا
کسی علم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا
پکارتا رہا بے آسرا یتیم لہو
کسی کے پاس سماعت کا وقت تھا نہ دماغ

نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا
کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سُراغ

○

اپریل ۱۹۶۵ء

سہرا

(طاہر نعیم اور یاسمین امتیاز کی شادی پر)

سجاؤ بزم، درِ میکدہ کشادہ کرو
اُٹھاؤ سازِ طرب، اہتمامِ بادہ کرو
جلاؤ چاند ستارے چراغ کافی نہیں
یہ شب ہے جشن کی شب روشنی زیادہ کرو

سجاؤ بزم کہ رنج و الم کے زخم سِلے
بساطِ لطف و محبّت پہ آج یار ملے
دُعا کو ہاتھ اٹھاؤ کہ وقت نیک آیا
رُخِ عزیز پہ سہرے کے آج پھول کھلے

اٹھاؤ ہاتھ کہ یہ وقت خوش مُدام رہے
شبِ نشاط و بساطِ طرب دوام رہے
تمہارا صحن منوّر ہو مثلِ صحنِ چمن
اور اس چمن میں بہاروں کا انتظام رہے

○

۲۴ مارچ ۱۹۶۲ء

تین گیت

(۱)

پنکھی راجہ رے پنکھی راجہ میٹھا بول
جوت جگی ہر من میں
بھنورا گو نجے ڈالی جھومے
بستی باڑی بن میں
جوت جگی ہر من میں

○

ندیا رانی رے
ندیا رانی میٹھا بول
میٹھا بول
گھاٹ لگی ہر ناؤ
رات گئی سکھ جاگا
پائل باندھو ناچو، گاؤ
گھاٹ لگی ہر ناؤ
ندیا رانی میٹھا بول

سندر گوری رے
سندر گوری میٹھا بول
جیوے روپ جوانی
بات کرے تو پھول کھلیں
اکھیاں ایک کہانی
جیسے دور سے تارا چمکے
چمکے روپ جوانی
جیوے روپ جوانی
جوت جگی ہر من میں
پنچھی راجہ میٹھا بول
ندیا رانی ...... سندر گوری

(۲)

سُکھی رہے تیری رات چندا سُکھی رہے تیری رات
دُور ہے چین کی نگری چندا دور ہے سُکھ کا گاؤں
جانے کیسے راہ کٹے گی ہارے تھک پاؤں
اوٹ میں بیٹھے بیری چندا۔ تھام لے میرا ہاتھ
سُکھی رہے تیری رات ــــ

تیری دَیا سے دیپ جلا ہے اس پاپن کے دوارے
جانے کیسے بھاگ جگے ہیں بھول گئے دکھ سارے
من کانپے جی دھڑکے، چندا چھوٹ نہ جائے ساتھ
سُکھی رہے تیری رات ـ

(۳)

بُجھ گیا چندا، لُٹ گیا گھروا، باتی بُجھ گئی رے
دیّا راہ دکھاؤ
موری باتی بجھ گئی رے، کوئی دیپ جلاؤ
رونے سے کب رات کٹے گی ہٹ نہ کرو، من جاؤ
منوا کوئی دیپ جلاؤ
کالی رات سے جیوتی لاؤ
اپنے دکھ کا دیپ بناؤ
ہٹ نہ کرو من جاؤ
منوا کوئی دیپ جلاؤ

○

۱۹۶۲ء

شامِ غم

ہر گھڑی عکسِ رُخِ یار لیے پھرتی ہے
کتنے مہ تاب شبِ تار لیے پھرتی ہے

سُن تو لو، دیکھ تو لو، مانو نہ مانو اے دل
شامِ غم سیکڑوں اقرار لیے پھرتی ہے

ہے وہی حلقۂ موہوم مگر موجِ نسیم
تارِ گیسو میں خمِ دار لیے پھرتی ہے

باغباں ہوش کہ برہم ہے مزاجِ گلشن
ہر کلی ہاتھ میں تلوار لیے پھرتی ہے

○

اقبال

زمانہ تھا کہ ہر فرد انتظارِ موت کرتا تھا
عمل کی آرزو باقی نہ تھی بازوئے انساں میں
بساطِ دہر پر گویا سکوتِ مرگ طاری تھا
صدائے نوحہ خواں تک بھی نہ تھی اس بزمِ ویراں میں

رگِ مشرق میں خونِ زندگی تھم تھم کے چلتا تھا
خزاں کا رنگ تھا گلزارِ ملّت کی بہاروں میں
فضا کی گود میں چپ تھے ستیزہ انگیز ہنگامے
شہیدوں کی صدائیں سو رہی تھیں کارزاروں میں

سُنی واماندۂ منزل نے آوازِ درا آخر
ترے نغموں نے آخر توڑ ڈالا سحرِ خاموشی
مے غفلت کے ماتے خوابِ دیرینہ سے جاگ اُٹھے
خود آگاہی سے بدلی قلب و جاں کی خود فراموشی

عروقِ مردہ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
فسردہ مشتِ خاکستر سے پھر لاکھوں شرر نکلے
زمیں سے نوریاں تا آسماں پرواز کرتے تھے
یہ خاکی زندہ تر تابندہ تر پائندہ تر نکلے

نبود و بود کے سب راز تو نے پھر سے بتلائے
ہر اک قطرے کو وسعت دے کے دریا کر دیا تو نے
ہر اک فطرت کو تو نے اسکے امکانات جتلائے
ہر اک ذرّے کو ہمدوشِ ثریّا کر دیا تو نے

فروغِ آرزو کی بستیاں آباد کر ڈالیں
زجاجِ زندگی کو آتشِ دوشیں سے بھر ڈالا
طلسمِ کُن سے تیرا لقمۂ جاں سوز کیا کم ہے
کہ تو نے صد ہزار افیونیوں کو مرد کر ڈالا

○

(ماہانہ طالب علمی ۱۹۳۱ء)

اور ایک نحوست کا پیکر
مینار گھڑی
ہر گھنٹہ کراہی وقت کے لمبے رستے پر
آواز تھکن میں ڈوبی ہوئی
میں، گرمکھ سنگھ سنتا ہی رہا
سُن سُن کے مگر یہ کہنا پڑا
یہ خواب بھی کتنا مہمل تھا

(زمانۂ طالب علمی)

خوابِ پریشاں

ہاں خواہشِ کے بیمار مرے تنہا دل نے
اک خواب سبھی خوابوں کی طرح پیارا دیکھا
لیکن مرے سب خوابوں کی طرح
یہ خواب بھی بے معنی نکلا
یہ خواب کہ بن جاؤں گا کسی دن۔
— بورڈنگ کا مانیٹر میں
حیرت، کہ ہوا ایسا ہی مگر
تھی کس کو خبر
اس موڑ پہ آ کے بخت رسا سو جائے گا
زینوں کی صدا آسیب زدہ
حمام میں غم کی گرد اُڑے

(بچوں کے لیے)

منیزہ کی سالگرہ

اک منیزہ ہماری بیٹی ہے — جو بہت ہی پیاری بیٹی ہے
ہم ہی کب اس کو پیار کرتے ہیں — سب کے سب اُس کو پیار کرتے ہیں
کیسے سب کو نہ آئے پیار اس پر — ہے وہی تو ہماری ڈکٹیٹر
پیار سے جو بھی جی چُرائے گا — وہ ضرور اس سے مار کھائے گا

خیر یہ بات تو ہنسی کی ہے — ویسے سچ مچ بہت وہ اچھی ہے
پھول کی طرح اُس کی رنگت ہے — چاند کی طرح اس کی صورت ہے
جب وہ خوش ہو کے مسکراتی ہے — چاندنی جگ میں پھیل جاتی ہے
پڑھنے لکھنے میں خوب قابل ہے — کھیلنے کودنے میں کامل ہے
عمر دیکھو تو آٹھ سال کی ہے — عقل دیکھو تو ساٹھ سال کی ہے
پھر وہ گانا بھی اچھا گاتی ہے — گرچہ تم کو نہیں سناتی ہے
بات کرتی ہے اس قدر میٹھی — جیسے ڈالی پہ کوک بلبل کی
ہاں کوئی اس کو جب ستاتا ہے — تب ذرا غصہ آ ہی جاتا ہے

پر وہ جلدی سے من بھی جاتی ہے — کب کسی کو بھلا ستاتی ہے
ہے شگفتہ بہت مزاج اُس کا — سارا عمدہ ہے کام کاج اس کا

ہے منیزہ کی آج سالگرہ — ہر طرف شور ہے مبارک کا
چاند تارے دعائیں دیتے ہیں — پھول اس کی بلائیں لیتے ہیں
باغ میں گا رہی ہے یہ بلبل — تم سلامت رہو منیزہ گل
امّی ابّا بھی اور باجی بھی — آنٹیاں اور بہن بھائی بھی
آج سب اس کو پیار کہتے ہیں — مل کے سب بار بار کہتے ہیں
پھر یونہی شور ہو مبارک کا — آئے سو بار تیری سالگرہ
سو تو کیا سو ہزار بار آئے — یوں کہو بے شمار بار آئے
لائے ہر بار اپنے ساتھ خوشی — اور ہم سب کہا کریں یونہی

یہ منیزہ ہماری بیٹی ہے
یہ بہت ہی پیاری بیٹی ہے

○

۱۹۵۷ء

(بچوں کے لیے)

پرسا، پرسو، پرس رام

ایک لڑکا جس کا پرسا نام تھا
پڑھنے لکھنے میں بڑا ناکام تھا

اس نے جب بھی امتحاں کوئی دیا
اس کو ہر پرچے میں انڈا ہی ملا

اس نے سب انڈے اکٹھے کر لیے
بیچنے کو ٹوکری میں دھر لیے

چیز عمدہ تھی ملے گاہک ہزار
بن گیا پس اس طرح وہ مالدار

باقی انڈے جو بچے اے مہرباں
اُس نے اس پر لا بٹھائیں مرغیاں

بیس دن کے بعد وہ چُوزے بنے
جن کو کھانے کے لیے ملتے چنے

ہو گئے جس وقت پل کر وہ جواں
ڈھیر لگ جاتا تھا انڈوں کا وہاں

بیچتا تھا روز "پرسا" بے شمار
لوٹتا رہتا تجارت کی بہار

چار پیسے جیب میں رہنے لگے
لوگ اب "پرسو" اسے کہنے لگے

فیضؔ اب دولت ہے اس کے پاس عام
لوگ سب کہتے ہیں اس کو پرس رام

نظمیں

دیباچہ

شاید کبھی افشا ہو، نگاہوں پہ تمہاری
ہر سادہ ورق جس سخنِ کُشتہ سے خوں ہے
شاید کبھی اس گیت کا پرچم ہو سرافراز
جو آمدِ صرصر کی تمنا میں نگوں ہے
شاید کبھی اس دل کی کوئی رگ تمہیں چبھ جائے
جو سنگِ سرِ راہ کی مانند زبوں ہے

قصیدہ

(۱)

کس طرح بیاں ہو ترا پیرایۂ تقریر
گویا سرِ باطل پہ چمکنے لگی شمشیر
وہ زور ہے اک لفظ اِدھر نطق سے نکلا
واں سینۂ اغیار میں پیوست ہوئے تیر
گرمی بھی ہے ٹھنڈک بھی روانی بھی سکوں بھی
تاثیر کا کیا کہیے ہے تاثیر ہی تاثیر
اعجاز اسی کا ہے کہ اربابِ ستم کی
اب تک کوئی انجام کو پہنچی نہیں تدبیر

اطرافِ وطن میں ہوا حق بات کا شہرہ
ہر ایک جگہ مکر و ریا کی ہوئی تشہیر
روشن ہوئے اُمید سے رُخ اہلِ وفا کے
پیشانیٔ اعدا پہ سیاہی ہوئی تحریر

(۲)

حُریتِ آدم کی رہِ سخت کے رہگیر
خاطر میں نہیں لاتے خیالِ دمِ تعزیر
کچھ ننگ نہیں، رنجِ اسیری، کہ پُرانا
مردانِ صفا کیش سے ہے رشتۂ زنجیر
کب دبدبۂ جبر سے دبتے ہیں کہ جن کے
ایمان و یقیں دل میں کیے رہتے ہیں تنویر
معلوم ہے اس کو کہ رہا ہوگی کسی دن
ظالم کے گراں ہاتھ سے مظلوم کی تقدیر
آخر کو سرافراز ہوا کرتے ہیں احرار
آخر کو گرا کرتی ہے ہر جبر کی تعمیر

ہر دور میں سر ہوتے ہیں قصرِ جم و دارا
ہر عہد میں دیوارِ ستم ہوتی ہے تسخیر
ہر دور میں ملعون شقاوت ہے شمر کی
ہر عہد میں مسعود ہے قربانیٔ شبّیر

(۳)

کرتا ہے قلم اپنے لب و نطق کی تطہیر
پہنچی ہے سرِ حرفِ دعا اب مری تحریر
ہر کام میں برکت ہو ہر اک عزم میں قوت
ہر گام پہ ہو منزلِ مقصود قدم گیر
ہر لحظہ ترا طالعِ اقبال سوا ہو
ہر لحظہ مددگار ہو تدبیر کی تقدیر
ہر بات ہو مقبول ہر اک بول ہو بالا
کچھ اور بھی رونق میں بڑھے شعلۂ تقریر
ہر دن ہو ترا لطفِ زباں اور زیادہ
اللہ کرے زورِ بیاں اور زیادہ

○

دستِ تہِ سنگ آمدہ

بیزار فضا، درپئے آزارِ صبا ہے
یوں ہے کہ ہر اک ہمدمِ دیرینہ خفا ہے
ہاں بادہ کشو! آیا ہے اب رنگ پہ موسم
اب سیر کے قابل روشِ آب و ہوا ہے
اُمڈی ہے ہر اک سمت سے الزام کی برسات
چھائی ہوئی ہر دانگ ملامت کی گھٹا ہے
وہ چیز بھری ہے کہ سلگتی ہے صراحی
ہر کاسۂ مے زہرِ ہلاہل سے سوا ہے
ہاں جام اٹھاؤ کہ بیادِ لبِ شیریں
یہ زہر تو یاروں نے کئی بار پیا ہے
اس جذبۂ دل کی نہ سزا ہے نہ جزا ہے
مقصودِ رہِ شوق وفا ہے نہ جفا ہے

احساسِ غمِ دل جو غمِ دل کا صلا ہے
اُس حسن کا احساس ہے جو تیری عطا ہے

ہر صبحِ گلستاں ہے ترا رُوئے بہاریں
ہر پھول تری یاد کا نقشِ کفِ پا ہے

ہر بھیگی ہوئی رات تری زلف کی شبنم
ڈھلتا ہوا سورج ترے ہونٹوں کی فضا ہے

ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک
ہر حرفِ تمنا ترے قدموں کی صدا ہے

تعزیرِ سیاست ہے، نہ غیروں کی خطا ہے
وہ ظلم جو ہم نے دلِ وحشی پہ کیا ہے

زندانِ رہِ یار میں پابند ہوئے ہم
زنجیر بکف ہے، نہ کوئی بند بپا ہے

"مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ الفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے"

○

سفرنامہ

یوں گماں ہوتا ہے بازو ہیں کروڑوں میرے
اور آفاق کی حد تک مرے تن کی حد ہے
دل مرا کوہ و دمن، دشت و چمن کی حد ہے

میرے کیسے میں ہے راتوں کا سیہ فام جلال
میرے ہاتھوں میں ہے صبحوں کی عنانِ گلگوں
میری آغوش میں پلتی ہے خدائی ساری
میرے مقدور میں ہے معجزۂ کُن فیکوں

۵

اب کوئی طبل بجے گا، نہ کوئی شاہسوار
صبح دم موت کی وادی کو روانہ ہو گا

اب کوئی جنگ نہ ہوگی نہ کبھی رات گئے
خون کی آگ کو اشکوں سے بجھانا ہوگا

کوئی دل دھڑکے گا شب بھر، نہ کسی آنگن میں
وہم، منحوس پرندے کی طرح آئے گا
سہم، خونخوار درندے کی طرح آئے گا
اب کوئی جنگ نہ ہوگی مے و ساغر لاؤ
خوں لُٹانا نہ کبھی اشک بہانا ہوگا
ساقیا: رقص کوئی رقصِ صبا کی صورت
مطربا: کوئی غزل، رنگِ حنا کی صورت

غزل

بساطِ رقص پہ صد شرق و غرب سے سرِ شام
دمک رہا ہے تری دوستی کا ماہِ تمام
چھلک رہی ہے ترے حُسنِ مہرباں کی شراب
بھرا ہوا ہے لبالب ہر اک نگاہ کا جام

گلے میں تنگ ترے حرفِ لطف کی بانہیں
پسِ خیال کہیں ساعتِ سفر کا پیام

ابھی سے یاد میں ڈھلنے لگی ہے صحبتِ شب
ہر ایک رُوئے حسیں، ہو چلا ہے بیش حسیں
ملے کچھ ایسے، جُدا یوں ہوئے، کہ فیضؔ اب کے
جو دل پہ نقش بنے گا وہ گُل ہے داغ نہیں

○

ہانگ چاؤ

جولائی ۱۹۵۶ء

شام

اس طرح ہے کہ ہر اک پیڑ کوئی مندر ہے
کوئی اُجڑا ہوا، بے نور پُرانا مندر
ڈھونڈتا ہے جو خرابی کے بہانے کب سے
چاک ہر بام، ہر اک دَر کا دمِ آخر ہے
آسماں کوئی پروہت ہے جو ہر بام تلے
جسم پر راکھ ملے ماتھے پہ سیندور ملے
سرنگوں بیٹھا ہے چپ چاپ نہ جانے کب سے
اس طرح ہے کہ پسِ پردہ کوئی ساحر ہے
جس نے آفاق پہ پھیلایا ہے یُوں سحر کا دام
دامنِ وقت سے پیوست ہے یُوں دامنِ شام
اب کبھی شام بُجھے گی نہ اندھیرا ہوگا
اب کبھی رات ڈھلے گی نہ سویرا ہوگا

آسماں آس لیے ہے کہ یہ جادو ٹوٹے
چُپ کی زنجیر کٹے وقت کا دامن چھُوٹے
دے کوئی سنکھ دُہائی، کوئی پایل بولے
کوئی بُت جاگے، کوئی سانولی گھونگھٹ کھولے

تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں

تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی
جس میں رکھا نہیں ہے کسی نے قدم
کوئی اُترا نہ میداں میں، دشمن نہ ہم
کوئی صف بن نہ پائی، نہ کوئی علَم
مُنتشر دوستوں کو صدا دے سکا
اجنبی دشمنوں کا پتا دے سکا
تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی
جس میں رکھا نہیں ہم نے اب تک قدم
تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارا نہیں

جسم خستہ ہے، ہاتھوں میں یارا نہیں
اپنے بس کا نہیں بارِ سنگِ ستم
بارِ سنگِ ستم، بارِ کہسارِ غم

جس کو چھُو کر سبھی اک طرف ہو گئے
بات کی بات میں ذی شرف ہو گئے

دوستو، کوئے جاناں کی نامہرباں
خاک پر اپنے روشن لہو کی بہار
اب نہ آئے گی کیا؟ اب کھِلے گا نہ کیا
اُس کفِ نازنیں پر کوئی لالہ زار؟
اِس حزیں خامشی میں نہ لَوٹے گا کیا؟
شورِ آوازِ حق، نعرۂ گیر و دار

شوق کا امتحاں جو ہُوا سُو ہُوا
جسم و جاں کا زیاں جو ہُوا سُو ہُوا
سُود سے پیشتر ہے زیاں اور بھی
دوستو، ماتمِ جسم و جاں اور بھی
اور بھی تلخ تر امتحاں اور بھی

○

جنوری ۱۹۵۸ء

شورشِ زنجیر بسم اللہ

ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ
ہر اک جانب مچا کہرامِ دار و گیر بسم اللہ
گلی کوچوں میں بکھری شورشِ زنجیر بسم اللہ

درِ زنداں پہ بُلوائے گئے پھر سے جنوں والے
دریدہ دامنوں والے، پریشاں گیسوؤں والے
جہاں میں دردِ دل کی پھر ہوئی توقیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

گِنو سب داغ دل کے حسرتیں شوقیں نگاہوں کی
سرِ دربار پُرسش ہو رہی ہے پھر گناہوں کی
کرو یارو شمارِ نالۂ شب گیر بسم اللہ

ستم کی داستاں، کُشتہ دلوں کا ماجرا کہیے
جو زیرِ لب نہ کہتے تھے وہ سب کچھ برملا کہیے
مُصر ہے محتسب رازِ شہیدانِ وفا کہیے
لگی ہے حرفِ ناگُفتہ پر اب تعزیر بسم اللہ
سرِ مقتل چلو بے زحمتِ تقصیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

لاہور جیل جنوری ۱۹۵۹ء

آج بازار میں پابجولاں چلو

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو

دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

حاکمِ شہر بھی، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی

ان کا دم ساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے
رختِ دل باندھ لو دلفگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

لاہور جیل
۱۱ر فروری ۱۹۵۹ء

قیدِ تنہائی

دُور آفاق پر لہرائی کوئی نور کی لہر
خواب ہی خواب میں بیدار ہوا درد کا شہر
خواب ہی خواب میں بیتاب نظر ہونے لگی
عدم آبادِ جدائی میں سحر ہونے لگی
کاسۂ دل میں بھری اپنی صبوحی میں نے
گھول کر تلخئ دیروز میں امروز کا زہر
دُور آفاق پہ لہرائی کوئی نور کی لہر
آنکھ سے دُور کسی صبح کی تمہید لیے
کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت
عدم آبادِ جدائی میں مسافر صورت

بے خبر گزری، پریشانیٔ اُمّید لیے
گھول کر تلخیٔ دیروز میں امروز کا زہر
حسرتِ روزِ ملاقات رقم کی میں نے
دیس پردیس کے یارانِ قدح خوار کے نام
حُسنِ آفاق و جمالِ لب و رُخسار کے نام

زندانِ قلعۂ لاہور
مارچ ۱۹۵۹ء

حمد

مالکِ شہرِ زندگی تیرا
شکر کس طور سے ادا کیجے
دولتِ دل کا کچھ شمار نہیں
تنگدستی کا کیا گلہ کیجے

جو ترے حُسن کے فقیر ہوئے
اُن کو تشویشِ روزگار کہاں!
درد بیچیں گے گیت گائیں گے
اس سے خوش وقت کاروبار کہاں؟

جام چھلکا تو جم گئی محفل
منّتِ لطفِ غمگسار کسے؟

اشک ٹپکا تو عکس لیا حسن
رنج کم ظرفیٔ بہار کسے؟

خوش نشیں ہیں کہ چشم و دل کی مراد
دَیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے

کون ایسا غنی ہے جس سے کوئی
نقدِ شمس و قمر کی بات کرے
جس کو شوقِ نبرد ہو ہم سے،
جائے تسخیرِ کائنات کرے

(۱) ملاقات مری

ساری دیوار سیہ ہو گئی تا حلقۂ بام
راستے بجھ گئے رخصت ہوئے رہ گیر تمام
اپنی تنہائی سے گویا ہوئی پھر رات مری
ہو نہ ہو آج پھر آئی ہے ملاقات مری
اک ہتھیلی پہ حنا، ایک ہتھیلی پہ لہو
اک نظر زہر لیے، ایک نظر میں دارُو

دیر سے منزلِ دل میں کوئی آیا نہ گیا
فرقتِ درد میں بے آب ہوا تختۂ داغ
کس سے کہیے کہ بھرے رنگ سے زخموں کے ایاغ
اور پھر خود ہی چلی آئی ملاقات مری
آشنا موت جو دشمن بھی ہے غمخوار بھی ہے
وہ جو ہم لوگوں کی قاتل بھی ہے دلدار بھی ہے

(۲) ختم ہوئی بارشِ سنگ

ناگہاں آج مرے تارِ نظر سے کٹ کر
ٹکڑے ٹکڑے ہوئے آفاق پہ خورشید و قمر
اب کسی سمت اندھیرا نہ اُجالا ہوگا
بُجھ گئی دل کی طرح راہِ وفا میرے بعد
دوستو! قافلۂ درد کا اب کیا ہوگا

اب کوئی اور کرے پرورشِ گلشنِ غم
دوستو ختم ہوئی دیدۂ تر کی شبنم
تھم گیا شورِ جنوں ختم ہوئی بارشِ سنگ
خاکِ رہ آج لیے ہے لبِ دلدار کا رنگ
کوئے جاناں میں کھُلا میرے لہو کا پرچم
دیکھیے دیتے ہیں کس کس کو صدا میرے بعد
"کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد"

نومبر ۱۹۶۰ء

کہاں جاؤ گے؟

اور کچھ دیر میں لُٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے
عرش کے دیدۂ نمناک سے باری باری
سب ستارے سرِ خاشاک برس جائیں گے
آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا، بچھائے گا کوئی
بے وفائی کی گھڑی، ترکِ مدارات کا وقت
اس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی
ترکِ دُنیا کا سماں، ختمِ ملاقات کا وقت
اس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے؟
اس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں، رہنے دو
کوئی، اِس وقت ملے گا ہی نہیں، رہنے دو

اور ملے گا بھی تو اِس طور کہ پچھتاؤ گے
اِس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے

اور کچھ دیر ٹھہر جاؤ کہ پھر نشترِ صبح
زخم کی طرح ہر اک آنکھ کو بیدار کرے
اور ہر کشتۂ بیگانگیٔ آخرِ شب
بھول کر ساعتِ درماندگیٔ آخرِ شب
جان پہچان ملاقات پہ اصرار کرے

○

دسمبر ۱۹۶۱ء

شہرِ یاراں

آسماں کی گود میں دم توڑتا ہے طفلِ ابر
جم رہا ہے ابر کے ہونٹوں پہ خوں آلود کف
بُجھتے بُجھتے بجھ گئی ہے عرش کے حجروں میں آگ
دھیرے دھیرے بجھ رہی ہے ماتمی تاروں کی صف
اے صبا شاید ترے ہمراہ یہ خوں رنگ شام
سر جھکائے جا رہی ہے شہرِ یاراں کی طرف
شہرِ یاراں، جس میں اس دم ڈھونڈتی پھرتی ہے موت
شیر دل بانکوں میں اپنے تیر و نشتر کے ہدف
اِک طرف بجتی ہیں جوشِ زیست کی شہنائیاں
اک طرف چنگھاڑتے ہیں اہرمن کے طبل و دف
جا کے کہنا اے صبا، بعد از سلامِ دوستی
آج شب جس دم گزر ہو شہرِ یاراں کی طرف

دشتِ شب میں اس گھڑی چپ چاپ ہے شاید رواں
ساقیِٔ صبحِ طرب، نغمہ بلب، ساغر بکف
وہ پہنچ جائے تو ہوگی پھر سے برپا انجمن
اور ترتیبِ مقام و منصب و جاہ و شرف

○

خوشا ضمانتِ غم

دیارِ یار، تری جوششِ جنوں پہ سلام
مرے وطن، ترے دامانِ تار تار کی خیر
رہِ یقیں، تری افشانِ خاک و خوں پہ سلام
مرے چمن، ترے زخموں کے لالہ زار کی خیر
ہر ایک خانۂ ویراں کی تیرگی پہ سلام
ہر ایک خاک بسر، خانماں خراب کی خیر
ہر ایک کشتۂ ناحق کی خامشی پہ سلام
ہر ایک دیدۂ پُرنم کی آب و تاب کی خیر
رواں رہے یہ روایت، خوشا ضمانتِ غم
نشاط ختمِ غمِ کائنات سے پہلے

ہر اک کے ساتھ رہے دولتِ امانتِ غم
کوئی نجات نہ پائے نجات سے پہلے

سکوں ملے نہ کبھی تیرے پا نگاروں کو
جمالِ خونِ سرِ خار کو نظر نہ لگے

اماں ملے نہ کہیں تیرے جاں نثاروں کو
جلالِ فرقِ سرِ دار کو نظر نہ لگے

لندن ۶۲ء ۱۹

جب تیری سمندر آنکھوں میں

(گیت)

یہ دھوپ کنارا، شام ڈھلے
ملتے ہیں دونوں وقت جہاں
جو رات نہ دن، جو آج نہ کل
پل بھر کو امر، پل بھر میں دھواں
اس دھوپ کنارے، پل دو پل
ہونٹوں کی لپک
باہوں کی چھنک
یہ میل ہمارا، جھوٹ نہ سچ
کیوں راز کرو، کیوں دوش دھرو
کس کارن جھوٹی بات کرو

جب تیری سمندر آنکھوں میں
اس شام کا سورج ڈوبے گا
سُکھ سوئیں گے گھر دَر والے
اور راہی اپنی رَہ لے گا

لندن ۳ ۱۹۶ء

رنگ ہے دل کا مرے

تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے،
آسماں حدّ نظر، راہگزر راہگزر، شیشۂ مے شیشۂ مے،
اور اب شیشۂ مے، راہگزر، رنگِ فلک،
رنگ ہے دل کا مرے، "خونِ جگر ہونے تک"
چمپئی رنگ کبھی، راحتِ دیدار کا رنگ
سرمئی رنگ کہ ہے ساعتِ بیزار کا رنگ
زرد پتوں کا، خس و خار کا رنگ
سُرخ پھولوں کا دہکتے ہوئے گلزار کا رنگ
زہر کا رنگ، لہو رنگ، شبِ تار کا رنگ،
آسماں، راہگزر، شیشۂ مے،
کوئی بھیگا ہوا دامن، کوئی دُکھتی ہوئی رگ

کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے

اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رُت، کوئی شے،
ایک جگہ پر ٹھہرے،
پھر سے اک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے،
آسماں حدِ نظر، راہگزر راہگزر، شیشۂ مے شیشۂ مے،

○

ماسکو
اگست ۱۹۶۳ء

پاس رہو

تم مرے پاس رہو،
میرے قاتل، مرے دلدار، مرے پاس رہو،
جس گھڑی رات چلے،
آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے،
مرہمِ مشک لیے، نشترِ الماس لیے،
بَین کرتی ہوئی، ہنستی ہوئی، گاتی نکلے
درد کے کاسنی پازیب بجاتی نکلے،
جس گھڑی سینوں میں ڈوبے ہوئے دل
آستینوں میں نہاں ہاتھوں کی رہ تکنے لگیں،
آس لیے،
اور بچّوں کے بلکنے کی طرح قُلقُلِ مے،

بہرِ نا سودگی مچلے تو منائے نہ منے،
جب کوئی بات بنائے نہ بنے،
جب نہ کوئی بات چلے،
جس گھڑی رات چلے،
جس گھڑی ماتمی، سُنسان، سیہ رات چلے
پاس رہو
میرے قاتل، مرے دلدار مرے پاس رہو،

○

ماسکو، ۱۹۶۳ء

منظر

رہگزر، سائے، شجر، منزل و در، حلقۂ بام
بام پر سینۂ مہتاب کھُلا، آہستہ
جس طرح کھولے کوئی بندِ قبا، آہستہ
حلقۂ بام تلے، سایوں کا ٹھہرا ہوا نیل
نیل کی جھیل
جھیل میں چپکے سے تیرا، کسی پتے کا حباب
ایک پَل تیرا، چلا، پھوٹ گیا، آہستہ
بہت آہستہ، بہت ہلکا، خُنک رنگِ شراب
میرے شیشے میں ڈھلا آہستہ
شیشہ و جام، صراحی، ترے ہاتھوں کے گلاب

جس طرح دُور کسی خواب کا نقش
آپ ہی آپ بنا، اور مِٹا آہستہ

دل نے دُہرایا کوئی حرفِ وفا، آہستہ
تم نے کہا، "آہستہ"،
چاند نے جُھک کے کہا
"اور ذرا آہستہ"

○

ماسکو ۱۹۶۴ء

اے حبیبِ عنبر دست

(ایک اجنبی خاتون کے نام، خوشبو کا تحفہ وصول ہونے پر)

کسی کے دستِ عنایت نے کُنجِ زنداں میں
کیا ہے آج عجب دل نواز بندوبست
مہک رہی ہے فضا زلفِ یار کی صورت
ہوا ہے گرمیٔ خوشبو سے اس طرح سرمست
ابھی ابھی کوئی گزرا ہے گُلبدن گویا
کہیں قریب سے، گیسو بدوش، غنچہ بدست

لیے ہے بُوئے رفاقت اگر ہوائے چمن
تو لاکھ پہرے بٹھائیں قفس پہ ظلم پرست
ہمیشہ سبز رہے گی وہ شاخِ مہر و وفا
کہ جس کے ساتھ بندھی ہے دلوں کی فتح و شکست

یہ شعر حافظِ شیراز، اے صبا! کہنا
ملے جو تجھ سے کہیں وہ حبیبِ عنبر دست
"خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
بجز بنائے محبّت کہ خالی از خلل است"

○

سنٹرل جیل، حیدرآباد (سندھ)

۲۸، ۲۹ اپریل ۱۹۵۳ء

ملاقات

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے، کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نور، رو گئے ہیں

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتّے

گرے ہیں، اور تیرے گیسوؤں میں
اُلجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اسی کی شبنم سے خامشی کے
یہ چند قطرے، تری جبیں پر
برس کے ہیرے پرُو گئے ہیں

(۲)

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن!
اسی سیاہی میں رُونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے

وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے

(وہ غم، جو اس رات کا ثمر ہے)
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے

ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں، اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

(۳)

الم نصیبوں، جگر فگاروں
کی صبح، افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن اُفق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھِل کر

شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

○

منٹگمری جیل
۱۲ر اکتوبر تا ۳ر نومبر ۱۹۵۴ء

واسوخت

سچ ہے ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے
بے شک ستم جناب کے سب دوستانہ تھے

ہاں، جو جفا بھی آپ نے کی، قاعدے سے کی
ہاں، ہم ہی کاربند اصولِ وفا نہ تھے

آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

کیوں دادِ غم ہمیں نے طلب کی، بُرا کیا
ہم سے جہاں میں کُشتۂ غم اور کیا نہ تھے؟

گر فکرِ زخم کی تو خطاوار ہیں کہ ہم
کیوں محوِ مدحِ خوبیٔ تیغ ادا نہ تھے

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دُکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

لب پر ہے تلخیٔ مے ایام، ورنہ فیضؔ
ہم تلخیٔ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

○

منٹگمری جیل

۲۴ر نومبر ۱۹۵۳ء

اے روشنیوں کے شہر

سبزہ سبزہ، سوکھ رہی ہے پھیکی، زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دُور اُفق تک گھٹتی، بڑھتی، اُٹھتی، گرتی رہتی ہے
کُہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر

بستا ہے اِس کُہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر
اے روشنیوں کے شہر

کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سُو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ

آج مرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر

شبِ خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رَو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، اِن سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیئے جلائیں، اُونچی رکھیں لَو

○

لاہور جیل —— منٹگمری جیل

۲۸ مارچ تا ۱۵ اپریل ۱۹۵۴ء

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

(ایتھل اور جولیس روزنبرگ کے خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

سُولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

جب گھُلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم

اپنا غم تھا گواہی ترے حُسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی
تیری الفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے عَلَم
اور نکلیں گے عُشّاق کے قافلے

جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

○

منٹگمری

۱۵ مئی ۱۹۵۴ء

دریچہ

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے
ہر ایک وصلِ خداوند کی اُمنگ لیے

کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہِ تابناک کرتے ہیں

کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دونیم
کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں

ہر آئے دن یہ خداوندگانِ مہر و جمال
لہو میں غرق مرے غمکدے میں آتے ہیں

اور آئے دن مری نظروں کے سامنے ان کے
شہید جسم سلامت اُٹھائے جاتے ہیں

منٹگمری جیل دسمبر ۱۹۵۴

درد آئے گا دبے پاؤں....

اور کچھ دیر میں، جب پھر مرے تنہا دل کو
فکر آلے گی کہ تنہائی کا کیا چارہ کرے
درد آئے گا دبے پاؤں، لیے، سُرخ چراغ
وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے

شعلۂ درد جو پہلو میں لپک اُٹھے گا
دل کی دیوار پہ ہر نقش دمک اُٹھے گا

حلقۂ زلف کہیں، گوشۂ رخسار کہیں
ہجر کا دشت کہیں، گلشنِ دیدار کہیں
لطف کی بات کہیں، پیار کا اقرار کہیں

دل سے پھر ہوگی مری بات کہ اے دل اے دل
یہ جو محبوب بنا ہے تری تنہائی کا
یہ تو مہماں ہے گھڑی بھر کا، چلا جائے گا
اس سے کب تیری مصیبت کا مداوا ہوگا
مشتعل ہو کے ابھی اُٹھیں گے وحشی سائے
یہ چلا جائے گا، رہ جائیں کے باقی سائے
رات بھر جن سے ترا خون خرابا ہوگا
جنگ ٹھہری ہے کوئی کھیل نہیں ہے اے دل
دشمنِ جاں ہیں سبھی، سارے کے سارے قاتل
یہ کڑی رات بھی، یہ سائے بھی، تنہائی بھی
درد اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے اے دل
لاؤ سلگاؤ کوئی جوشِ غضب کا انگار
طیش کی آتشِ جرار کہاں ہے لاؤ
وہ دہکتا ہوا گلزار کہاں ہے لاؤ
جس میں گرمی بھی ہے، حرکت بھی توانائی بھی

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہو گا اندھیرے کی فصیلوں کے اُدھر
ان کو شعلوں کے رَجَز اپنا پتا تو دیں گے
خیر، ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی، صدا تو دیں گے
دُور کتنی ہے ابھی صبح، بتا تو دیں گے

○

منٹگمری جیل
یکم دسمبر ۱۹۵۴ء

Africa, Come Back.(۱)

(ایک رجز)

آ جاؤ، میں نے سُن لی ترے ڈھول کی ترنگ
آ جاؤ، مست ہو گئی میرے لہو کی تال
"آ جاؤ افریقا"

آ جاؤ، میں نے دُھول سے ماتھا اٹھا لیا
آ جاؤ، میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آ جاؤ، میں نے درد سے بازو چھڑا لیا
آ جاؤ، میں نے نوچ دیا بے کسی کا جال
"آ جاؤ افریقا"

۱۔ افریقی حریت پسندوں کا نعرہ

پنجے میں ہتھکڑی کی کڑی بن گئی ہے گرز
گردن کا طوق توڑ کے ڈھالی ہے میں نے ڈھال
"آجاؤ ایفریقا"

جلتے ہیں ہر کچھار میں بھالوں کے مرگ نین
دشمن لہو سے رات کی کالک ہوئی ہے لال
"آجاؤ ایفریقا"

دھرتی دھڑک رہی ہے مرے ساتھ ایفریقا
دریا تھرک رہا ہے، تو بَن دے رہا ہے تال
"آجاؤ ایفریقا"

میں ایفریقا ہوں، دھار لیا میں نے تیرا روپ
میں تُو ہوں، میری چال ہے تیری، ببر کی چال
"آجاؤ ایفریقا"

آؤ ببر کی چال

آجاؤ ایفریقا

○ منٹگمری جیل ۱۴ر جنوری ۱۹۵۵ء

یہ فصل امیدوں کی ہمدم

سب کاٹ دو
بسمل پودوں کو
بے آب، سسکتے مت چھوڑو
سب نوچ لو
بیکل پھولوں کو
شاخوں پہ بلکتے مت چھوڑو

یہ فصل اُمیدوں کی ہمدم
اِس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت، صبحوں شاموں کی
اب کے بھی اکارت جائے گی

کھیتی کے کونوں، کھدروں میں
پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو
پھر مٹی سینچو اشکوں سے
پھر اگلی رُت کی فکر کرو

پھر اگلی رُت کی فکر کرو
جب پھر اک بار اُجڑنا ہے
اِک فصل پکی تو بھر پایا
جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے

○

منٹگمری جیل

۳۰ مارچ ۱۹۵۵ء

بیداد کچھ تو ہو

(قوالی)

کوئے ستم کی خامشی آباد کچھ تو ہو
کچھ تو کہو ستم کشو، فریاد کچھ تو ہو
بیداد گر سے شکوۂ بیداد کچھ تو ہو
بولو، کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا
اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا
مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشنِ رقص کا

رنگیں لہو سے پنجۂ صیاد کچھ تو ہو

خوں پر گواہ دامنِ جلاد کچھ تو ہو
جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو
گر تن نہیں، زباں سہی، آزاد کچھ تو ہو
دُشنام، نالہ، ہاؤ ہُو، فریاد، کچھ تو ہو
چیخے ہے درد، اے دلِ برباد کچھ تو ہو
بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو
بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو

○

منٹگمری جیل

۱۳ اپریل ۱۹۵۵ء

کوئی عاشق کسی محبوبہ سے

یاد کی راہ گزر جس پہ اسی صورت سے
مدتیں بیت گئی ہیں تمہیں چلتے چلتے
ختم ہو جائے جو دو چار قدم اور چلو
موڑ پڑتا ہے جہاں دشتِ فراموشی کا
جس سے آگے نہ کوئی میں ہوں، نہ کوئی تم ہو

سانس تھامے ہیں نگاہیں، کہ نہ جانے کس دم
تم پلٹ آؤ، گذر جاؤ، کہ مڑ کر دیکھو

گرچہ واقف ہیں نگاہیں کہ یہ سب دھوکا ہے
گر کہیں تم سے ہم آغوش ہوئی پھر سے نظر
پھوٹ نکلے گی وہاں اور کوئی راہ گزر

پھر اسی طرح جہاں ہوگا مقابل پیہم
سایۂ زلف کا اور جنبشِ بازو کا سفر

دوسری بات بھی جھوٹی ہے کہ دل جانتا ہے
یاں کوئی موڑ، کوئی دشت کوئی گھات نہیں
جس کے پردے میں مرا ماہِ رواں ڈوب سکے
تم سے چلتی رہے یہ راہ، یونہی اچھا ہے
تم نے مڑ کر بھی نہ دیکھا تو کوئی بات نہیں

○

منٹگمری جیل

۳۰ مارچ ۱۹۵۵ء

سیاسی لیڈر کے نام

سالہا سال یہ بے آسرا، جکڑے ہوئے ہات
رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرمِ ستیز
جس طرح تیتری، کہسار پہ یلغار کرے
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جابجا نور نے اک جال سا بن رکھا ہے
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے
تیرا سرمایہ، تری آس یہی ہات تو ہیں
اور کچھ بھی تو نہیں پاس، یہی ہات تو ہیں
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت، لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میّت کے تلے دب جائے

اے دلِ بے تاب ٹھہر!

تیرگی ہے کہ اُمنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے

رات کا گرم لہو اور بھی بہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر!

ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردۂ ساز
مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی
ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں
لغزشِ پا میں ہے پابندئ آداب ابھی

اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اُٹھ جائے گی
یہ گرانباریٔ آداب بھی اُٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی، چھنکتی ہی رہے

مرے ہمدم مرے دوست

گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم، مرے دوست،
گر مجھے اس کا یقیں ہو کہ ترے دل کی تھکن
تیری آنکھوں کی اُداسی، ترے سینے کی جلن
میری دلجوئی، مرے پیار سے مٹ جائے گی
گر مرا حرفِ تسلّی وہ دوا ہو جس سے
جی اُٹھے پھر ترا اُجڑا ہوا بے نور دماغ
تیری پیشانی سے دُھل جائیں یہ تذلیل کے داغ
تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے
گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم، مرے دوست،
روز و شب، شام و سحر، میں تجھے بہلاتا رہوں
میں تجھے گیت سُناتا رہوں ہلکے شیریں
آبشاروں کے، بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت

آمدِ صبح کے، مہتاب کے، سیّاروں کے گیت
تجھ سے میں حسن و محبت کی حکایات کہوں
کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں
کیسے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش
دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں
کس طرح عارضِ محبوب کا شفّاف بلور
یک بیک بادۂ احمر سے دہک جاتا ہے
کیسے گلچیں کے لیے جھکتی ہے خود شاخِ گلاب
کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے
یوں ہی گاتا رہوں، گاتا رہوں، تیری خاطر
گیت بُنتا رہوں بیٹھا رہوں، تیری خاطر

پر مرے گیت ترے دکھ کا مداوا ہی نہیں
نغمہ جرّاح نہیں، مونس و غمخوار سہی،
گیت نشتر تو نہیں، مرہم آزار سہی

تیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا
اور یہ سفّاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی رُوح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا

گاڑی بھاگی رہی ہے
سیٹی بجا رہی ہے
چلنا ہی زندگی ہے چلتی ہی جا رہی ہے

صبحِ آزادی

(اگست ۱۹۴۷ء)

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غمِ دل
جواں لہو کی پُراسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں بانہیں، بدن بُلاتے رہے

بہت عزیز تھی لیکن رُخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سُبک سُبک تھی تمنا، دبی دبی تھی تھکن

سُنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور
سُنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذاب، ہجر حرام

جگر کی آگ، نظر کی اُمنگ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغ سر رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دِل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

دو آوازیں

پہلی آواز

اب سعی کا امکاں اور نہیں، پرواز کا مضموں ہو بھی چکا
تاروں پہ کمندیں پھینک چکے، مہتاب پہ شبخوں ہو بھی چکا
اب اور کسی فردا کے لیے ان آنکھوں سے کیا پیماں کیجے
کس خواب کے جھوٹے افسوں سے تسکینِ دلِ ناداں کیجے
جینے کے فسانے رہنے دو، اب ان میں الجھ کر کیا لیں گے
اک موت کا دھندا باقی ہے، جب چاہیں گے نبٹا لیں گے
یہ تیرا کفن، وہ میرا کفن، یہ میری لحد، وہ تیری ہے۔

دوسری آواز

ہستی کی متاعِ بے پایاں جاگیر تری ہے نہ میری ہے
اس بزم میں اپنی مشعلِ دل بسمل ہے تو کیا، رخشاں ہے تو کیا

یہ بزم چراغاں رہتی ہے، اک طاق اگر ویراں ہے تو کیا
افسردہ ہیں گر ایام ترے، بدلا نہیں مسلکِ شام و سحر
ٹھہرے نہیں موسمِ گُل کے قدم، قائم ہے جمالِ شمس و قمر
آباد ہے وادیٔ کاکُل و لب، شاداب و حسیں گلگشتِ نظر
مقسوم ہے لذّتِ دردِ جگر، موجود ہے نعمتِ دیدۂ تر
اس دیدۂ تر کا شکر کرو، اس ذوقِ نظر کا شکر کرو
اس شام و سحر کا شکر کرو، ان شمس و قمر کا شکر کرو

پہلی آواز

گر ہے یہی مسلکِ شمس و قمر اِن شمس و قمر کا کیا ہوگا
رعنائیٔ شب کا کیا ہوگا، اندازِ سحر کا کیا ہوگا
جب خونِ جگر برفاب بنا، جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں
اس دیدۂ تر کا کیا ہوگا، اس ذوقِ نظر کا کیا ہوگا
جب شعر کے خیمے راکھ ہوئے، نغموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں
یہ ساز کہاں سر پھوڑیں گے، اس کلکِ گہر کا کیا ہوگا

جب کنجِ قفس مسکن ٹھہرا، اور جیب و گریباں طوق و رسن
آئے کہ نہ آئے موسمِ گل، اس دردِ جگر کا کیا ہوگا

دوسری آواز

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک، اس خُوں میں حرارت ہے جب تک
اس دل میں صداقت ہے جب تک، اس نطق میں طاقت ہے جب تک
ان طوق و سلاسل کو ہم تم، سکھلائیں گے شورشِ بربط و نَے
وہ شورش جس کے آگے زبوں ہنگامۂ طبلِ قیصر و کَے
آزاد ہیں اپنے فکر و عمل بھرپور خزینہ ہمّت کا
اک عمر ہے اپنی ہر ساعت، امروز ہے اپنا ہر فردا
یہ شام و سحر، یہ شمس و قمر، یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ لوح و قلم، یہ طبل و علم، یہ مال و حشم سب اپنے ہیں

○

مقتل

(قوالی)

کہاں ہے منزلِ راہِ تمنا ہم بھی دیکھیں گے
یہ شب ہم پر بھی گزرے گی، یہ فردا ہم بھی دیکھیں گے
ٹھہر اے دل، جمالِ روئے زیبا ہم بھی دیکھیں گے

ذرا صیقل تو ہو لے تشنگی بادہ گساروں کی
دبا رکھیں گے کب تک جوشِ صہبا ہم بھی دیکھیں گے
اُٹھا رکھیں گے کب تک جام و مینا ہم بھی دیکھیں گے

صلا آ تو چکے محفل میں اُس کوئے ملامت سے
کسے روکے گا شورِ پندِ بے جا ہم بھی دیکھیں گے
کسے ہے جا کے لوٹ آنے کا یارا ہم بھی دیکھیں گے

چلے ہیں جان و ایماں آزمانے آج دل والے
وہ لائیں لشکرِ اغیار و اعدا ہم بھی دیکھیں گے
وہ آئیں تو سرِ مقتل، تماشا ہم بھی دیکھیں گے

یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہمدم
جو اس ساعت میں پنہاں ہے اجالا ہم بھی دیکھیں گے
جو فرقِ صبح پر چمکے گا تارا ہم بھی دیکھیں گے

..... تمہارے حُسن کے نام!

سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حُسن کے نام

بکھر گیا جو کبھی رنگِ پیرہن سرِ بام
نکھر گئی ہے کبھی صبح، دوپہر، کبھی شام

کہیں جو قامتِ زیبا پہ سج گئی ہے قبا
چمن میں سرو و صنوبر سنور گئے ہیں تمام

بنی بساطِ غزل جب ڈبو لیے دل نے
تمہارے سایۂ رخسار و لب میں ساغر و جام

سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حُسن کے نام

تمہارے ہات پہ ہے تابشِ حنا جب تک
جہاں میں باقی ہے دلداریٔ عروسِ سخن

تمہارا حُسن جواں ہے تو مہرباں ہے فلک
تمہارا دم ہے تو دمساز ہے ہوائے وطن

اگرچہ تنگ ہیں اوقات سخت ہیں آلام
تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخیٔ ایام
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حُسن کے نام

○

ترانہ

دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے، کچھ اپنی جزا لے جائیں گے

اے خاک نشینو! اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے

اے ظلم کے ماتو لب کھولو، چپ رہنے والو، چپ کب تک
کچھ حشر تو اُن سے اُٹھے گا کچھ دُور تو نالے جائیں گے

دو عشق

(۱)

تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقیِ گلفام
وہ عکسِ رُخِ یار سے لہکے ہوئے ایّام
وہ پھول سی کھلتی ہوئی دیدار کی ساعت
وہ دل سا دھڑکتا ہوا اُمّید کا ہنگام

اُمّید، کہ لو جاگا غمِ دل کا نصیبہ
لو شوق کی ترسی ہوئی شب ہو گئی آخر
لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے
اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدّر

اِس بام سے نکلے گا ترے حُسن کا خورشید
اُس کُنج سے پھُوٹے گی کرن رنگِ حنا کی

اِس ڈر سے بہے گا تری رفتار کا سیماب
اُس راہ پہ پھولے شفق تیری قبا کی

پھر دیکھے ہیں وہ ہجر کے تپتے ہوئے دن بھی
جب فکرِ دل و جاں میں فغاں بھول گئی ہے
ہر شب وہ سیہ بوجھ کہ دل بیٹھ گیا ہے
ہر صبح کی لَو تیر سی سینے میں لگی ہے

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

(۲)

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں

ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائشِ منزل
رُخسار کے خم میں، کبھی کاکُل کی شکن میں

اس جانِ جہاں کو بھی یونہی قلب و نظر نے
ہنس ہنس کے صدا دی کبھی رو رو کے پکارا
پُورے کیے سب حرفِ تمنا کے تقاضے
ہر درد کو اُجیالا، ہر اک غم کو سنوارا

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنُوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی، آواز جرس کی
خیریّتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں
سب بھُول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پسِ زنداں، کبھی رسوا سرِ بازار

گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہلِ حَکَم برسرِ دربار

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھُوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل،
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

نوحہ

مجھ کو شکوہ ہے مرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے
لے گئے ساتھ مری عمرِ گزشتہ کی کتاب
اس میں تو میری بہت قیمتی تصویریں تھیں،
اس میں بچپن تھا مرا اور مرا عہدِ شباب
اس کے بدلے مجھے تم دے گئے جاتے جاتے
اپنے غم کا یہ دہکتا ہوا خوں رنگ گلاب
کیا کروں بھائی یہ اعزاز میں کیوں کر پہنوں؟
مجھ سے لے لو مری سب چاک قمیصوں کا حساب
آخری بار ہے، لو مان لو اک یہ بھی سوال!
آج تک تم سے میں لوٹا نہیں مایوسِ جواب
آ کے لے جاؤ تم اپنا یہ دہکتا ہوا پھول
مجھ کو لوٹا دو مری عمرِ گزشتہ کی کتاب

۱۸ جولائی ۵۲ء

ایرانی طلبا کے نام

(جو امن و آزادی کی جدوجہد میں کام آئے)

"یہ کون سخی ہیں
جن کے لہو کی
اشرفیاں، چھن چھن، چھن چھن،
دھرتی کی بیہم پیاسی
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں
یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم
یہ لکھ لُٹ
جن کے جسموں کی
بھرپور جوانی کا کُندن

یوں خاک میں ریزا ریزا ہے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے

”اے ارضِ عجم، اے ارضِ عجم!
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیئے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم
ان ہونٹوں نے اپنے مرجاں
ان ہاتھوں کی بے کل چاندی
کس کام آئی، کس ہاتھ لگی؟“

”اے پوچھنے والے پردیسی
یہ طفل و جواں
اُس نور کے نورس موتی ہیں
اُس آگ کی کچی کلیاں ہیں
جس میٹھے نور اور کڑوی آگ

سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صبحِ بغاوت کا گلشن
اور صبح ہوئی من من، تن تن،
ان جسموں کا چاندی سونا
ان چہروں کے نیلم، مرجاں
جگ مگ، جگ مگ، رخشاں رخشاں
جو دیکھنا چاہے پردیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کر
یہ زیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن!"

○

اگست ۱۹۵۲ء

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں

اب بھی خزاں کا راج ہے، لیکن کہیں کہیں
گوشے چمن چمن میں غزلخواں ہوئے تو ہیں

ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں، مگر
کچھ کچھ سحر کے رنگ پَرافشاں ہوئے تو ہیں

ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

ہاں، کج کرو کُلاہ کہ سب کچھ لٹا کے ہم
اب بے نیازِ گردشِ دوراں ہوئے تو ہیں

اہلِ قفس کی صبح چمن میں کھلے گی آنکھ
بادِ صبا سے وعدہ و پیماں ہوئے تو ہیں

ہے دشت اب بھی دشت مگر خونِ پا سے فیضؔ
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں

نثار میں تری گلیوں پہ ......

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے

ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کُشاد
کہ سنگ[۱] و خشت مقیّد ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جُو کے لیے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں!
بنے ہیں اہلِ ہوس، مدعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں

---

۱ سنگ را بستند و سگاں را کشادند (شیخ سعدی)

مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہو گی
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جُڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا، سو چھُوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چُن چُن کر
دامن میں چھُپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

شاید کہ اِنہیں ٹکڑوں میں کہیں
وہ ساغرِ دل ہے جس میں کبھی
صد ناز سے اترا کرتی تھی
صہبائے غمِ جاناں کی پری

پھر دُنیا والوں نے تم سے
یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا
جو مے تھی بہا دی مٹی میں
مہمان کا شہپر توڑ دیا

یہ رنگیں ریزے ہیں شاید
اُن شوخ بلوریں سپنوں کے
تم مست جوانی میں جن سے
خلوت کو سجایا کرتے تھے،

ناداری، دفتر، بھوک اور غم
ان سپنوں سے ٹکراتے رہے
بے رحم تھا چومکھ پتھراؤ
یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے

یا شاید ان ذرّوں میں کہیں
موتی ہے تمہاری عزّت کا

وہ جس سے تمہارے عجز پہ بھی
شمشاد قدوں نے رشک کیا

اس مال کی دھن میں پھرتے تھے
تاجر بھی بہت، رہزن بھی کئی
ہے چور نگر، یاں مفلس کی
گر جان بچی تو آن گئی

یہ ساغر، شیشے، لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط
چبھتے ہیں، لہو رلواتے ہیں

تم ناحق شیشے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دل کی گزر کب ہوتی ہے
اک بخیہ اُدھیڑا، ایک سیا
یوں عمر بسر کب ہوتی ہے

اس کارگہِ ہستی میں جہاں
یہ ساغر شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے
سب دامن پُر ہو سکتے ہیں

جو ہاتھ بڑھے یاور ہے یہاں
جو آنکھ اُٹھے، وہ بختاور
یاں دھن دولت کا انت نہیں
ہوں گھات میں ڈاکو لاکھ مگر

کب لُوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں

یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پربت کو، ہر ساگر کو
نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں
کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اٹھائی گیروں کی
ہر چال الجھائے جاتے ہیں

ان دونوں میں رن پڑتا ہے
نت بستی بستی، نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
وہ جوت جگاتے رہتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے رہتے ہیں

سب ساغر شیشے، لعل و گہر
اس بازی میں بد جاتے ہیں
اٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اِس رَن سے بلاوے آتے ہیں

○

زنداں کی ایک شام

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اُتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحن زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں، محو ہیں بنانے میں
دامنِ آسماں پہ نقش و نگار
شانۂ بام پر دمکتا ہے
مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل
خاک میں گھُل گئی ہے آبِ نجوم
نُور میں گھُل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے

لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موجِ دردِ فراقِ یار آئے

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اِس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گُل کریں تو ہم جانیں

○

زنداں کی ایک صبح

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آکر
چاند نے مجھ سے کہا "جاگ سحر آئی ہے
جاگ اس شب جو مئے خواب ترا حصّہ تھی
جام کے لب سے تہہِ جام اُتر آئی ہے"
عکسِ جاناں کو وداع کر کے اُٹھی میری نظر
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر
جابجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے، تیرتے، مرجھاتے رہے، کھلتے رہے
رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے

صحنِ زنداں میں رفیقوں کے سنہرے چہرے

سطحِ ظلمت سے دمکتے ہوئے اُبھرے کم کم
نیند کی اوس نے ان چہروں سے دھو ڈالا تھا
دیس کا درد، فراقِ رُخِ محبوب کا غم

دُور نوبت ہوئی پھرنے لگے بیزار قدم
زرد فاقوں کے ستائے ہوئے پہرے والے
اہلِ زنداں کے غضبناک، خروشاں نالے
جن کی بانہوں میں پھرا کرتے ہیں بانہیں ڈالے

لذّتِ خواب سے مخمور ہوائیں جاگیں
جیل کی زہر بھری چُور صدائیں جاگیں
دور دروازہ کھُلا کوئی، کوئی بند ہوا
دور مچلی کوئی زنجیر، مچل کے روئی
دور اُترا کسی تالے کے جگر میں خنجر

سر پٹکنے لگا رہ رہ کے دریچہ کوئی!
گویا پھر خواب سے بیدار ہوئے دشمنِ جاں
سنگ و فولاد سے ڈھالے ہوئے جنّاتِ گراں
جن کے چنگل میں شب و روز ہیں فریاد کُناں
میرے بیکار شب و روز کی نازک پریاں
اپنے شہپور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیر
جس کے ترکش میں ہیں امید کے جلتے ہوئے تیر

(ناتمام)

یاد

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے، ترے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں دُوری کے خس وخاک تلے
کھِل رہے ہیں، ترے پہلو کے سمن اور گلاب
اُٹھ رہی ہے کہیں قُربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم
دُور ـــــ اُفق پار چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم
اس قدر پیار سے، اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رُخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن آ بھی گئی وصل کی رات

خدا وہ وقت نہ لائے.....

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرّتِ پیہم تمام ہو جائے
تری حیات، تجھے تلخ جام ہو جائے
غموں سے آئنہ دل گداز ہو تیرا
ہجومِ یاس سے بیتاب ہو کے رہ جائے
وفورِ درد سے سیماب ہو کے رہ جائے
ترا شباب فقط خواب ہو کے رہ جائے
غرورِ حُسن سراپا نیاز ہو تیرا
طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے
تری نگاہ کسی غمگسار کو ترسے

خزاں رسیدہ تمنا بہار کو ترسے

کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جھکے

کہ جنسِ عجز و عقیدت سے تجھ کو شاد کرے

فریبِ وعدۂ فردا پہ اعتماد کرے

خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے

وہ دل کہ تیرے لیے بیقرار اب بھی ہے

وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

○

انتہائے کار

پندار کے خوگر کو
ناکام بھی دیکھو گے؟
آغاز سے واقف ہو
انجام بھی دیکھو گے؟
رنگینیٔ دنیا سے مایوس سا ہو جانا
دُکھتا ہوا دل لیکر تنہائی میں کھو جانا
ترسی ہوئی نظروں کو
حسرت سے جُھکا لینا
فریاد کے ٹکڑوں کو
آہوں میں چھپا لینا
راتوں کی خموشی میں چھپ کر کبھی رو لینا
مجبور جوانی کے ملبوس کو دھو لینا

جذبات کی وسعت کو
سجدوں سے گلبسا لینا
بھولی ہوئی یادوں کو
سینے سے لگا لینا

○

انجام

ہیں لبریز آہوں سے ٹھنڈی ہوائیں
اُداسی میں ڈوبی ہوئی ہیں گھٹائیں
محبت کی دُنیا پہ شام آچکی ہے
سیہ پوش ہیں زندگی کی فضائیں
مچلتی ہیں سینے میں لاکھ آرزوئیں
تڑپتی ہیں آنکھوں میں لاکھ التجائیں
تغافل کے آغوش میں سو رہے ہیں
تمہارے ستم اور میری وفائیں
مگر پھر بھی اے میرے معصوم قاتل
تمہیں پیار کرتی ہیں میری دعائیں

سرودِ شبانہ

گُم ہے اک کیف میں فضائے حیات
خامشی سجدۂ نیاز میں ہے
حُسنِ معصوم خوابِ ناز میں ہے

اے کہ تو رنگ و بو کا طوفاں ہے
اے کہ تو جلوہ گر بہار میں ہے
زندگی تیرے اختیار میں ہے
پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہارِ شباب
آ کہ کچھ دل کی سُن سُنا لیں ہم
آ، محبت کے گیت گا لیں ہم

میری تنہائیوں پہ شام رہے
حسرتِ دید ناتمام رہے
دل میں بیتاب ہے صدائے حیات
آنکھ گوہر نثار کرتی ہے
آسماں پر اُداس ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے
آ، کہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم
زندگی زرنگار کر لیں ہم

○

آخری خط

وہ وقت مری جان بہت دور نہیں ہے
جب درد سے رک جائیں گی سب زیست کی راہیں
اور حد سے گذر جائے گا اندوہِ نہانی
تھک جائیں گی ترسی ہوئی ناکام نگاہیں
چھن جائیں گے مجھ سے مرے آنسو، مری آہیں
چھن جائے گی مجھ سے مری بے کار جوانی

شاید مری الفت کو بہت یاد کرو گی
اپنے دلِ معصوم کو ناشاد کرو گی
آؤ گی مری گور پہ تم اشک بہانے
نوخیز بہاروں کے حسیں پھول چڑھانے

شاید مری تربت کو بھی ٹھکرا کے چلو گی
شاید مری بے سود وفاؤں پہ ہنسو گی
اس وضعِ کرم کا بھی تمہیں پاس نہ ہوگا
لیکن دلِ ناکام کو احساس نہ ہوگا
القصّہ مآلِ غمِ الفت پہ ہنسو تم
یا اشک بہاتی رہو، فریاد کرو تم
ماضی پہ ندامت ہو تمہیں یا کہ مسرت
خاموش پڑا سوئے گا واماندۂ الفت

حسینۂ خیال سے

مجھے دے دے

رسیلے ہونٹ، معصومانہ پیشانی، حسیں آنکھیں
کہ میں اک بار پھر رنگینیوں میں غرق ہو جاؤں
مری ہستی کو تیری اک نظر آغوش میں لے لے
ہمیشہ کے لیے اس دام میں محفوظ ہو جاؤں
ضیائے حسن سے ظلماتِ دنیا میں نہ پھر آؤں
گزشتہ حسرتوں کے داغ میرے دل سے دُھل جائیں
میں آنے والے غم کی فکر سے آزاد ہو جاؤں
مرے ماضی و مستقبل سراسر محو ہو جائیں
مجھے وہ اک نظر، اک جاودانی سی نظر دے دے

[براؤننگ]

"نذر....."

طرب زارِ تخیّل، شوقِ رنگیں کار کی دُنیا
مرے افکار کی جنّت، مرے اشعار کی دُنیا
شبِ مہتاب کی سحر آفریں مدہوش موسیقی
تمہاری دلنشیں آواز میں آرام کرتی ہے
بہار آغوش میں بہکی ہوئی رنگینیاں لے کر
تمہارے خندۂ گلریز کو بدنام کرتی ہے

تمہاری عنبریں زلفوں میں لاکھوں فتنے آوارہ
تمہاری ہر نظر سے سینکڑوں ساغر چھلکتے ہیں
تمہارا دل حسیں جذبوں سے یوں آباد ہے گویا
شفق زارِ جوانی میں فرشتے رقص کرتے ہیں

جہانِ آرزو! یہ بے رخی دیکھی نہیں جاتی
کہ شوقِ دید کو تم اس طرح بے سُود کر ڈالو
بہشتِ رنگ و بو! رعنائیاں محدود کر ڈالو
نجیف آنکھوں سے اِتنی دلکشی دیکھی نہیں جاتی

○

پیامِ تجدید

عہدِ اُلفت کو مدّتیں گزریں
دورِ راحت کو مدّتیں گزریں
مثلِ تصویرِ یاس ہے دُنیا
ہائے کتنی اُداس ہے دُنیا
پھر تجھے یاد کر رہا ہوں میں
کتنے بے کیف روز و شب ہیں کہ تو
وجہِ تزئینِ مہر و ماہ نہیں
حسرتِ دید کھو چکا ہوں میں
آہ میں اور تیری چاہ، نہیں!
اس تصنّع سے تھک گیا ہوں میں

آ، مجھے پھر شمار میں لے لے　　یادِ دوشینہ مت جگا پیاری

بے وفائی کا ذکر رہنے دے

میرے شکووں کی فکر رہنے دے

آ، گذشتہ کو بھول جا پیاری　　آ، مجھے پھر کنار میں لے لے

دردِ عہدِ فراق رو ڈالوں

دل کے دیرینہ داغ دھو ڈالوں

مری جاں اب بھی اپنا حُسن واپس پھیر دے مجھ کو

مری جاں اب بھی اپنا حُسن واپس پھیر دے مجھ کو
ابھی تک دل میں تیرے عشق کی قندیل روشن ہے
ترے جلووں سے بزمِ زندگی جنت بدامن ہے
مری روح اب بھی تنہائی میں تجھ کو یاد کرتی ہے
ہر اک تارِ نفس میں آرزو بیدار ہے اب بھی
ہر اک بے رنگ ساعت منتظر ہے تیری آمد کی
نگاہیں بچھ رہی ہیں راستہ زرکار ہے اب بھی
مگر جانِ حزیں صدمے سہے گی آخرش کب تک؟
تری بے مہریوں پہ جان دے گی آخرش کب تک؟
تری آواز میں سوئی ہوئی شیرینیاں آخر
مرے دل کی فسردہ خلوتوں میں جا نہ پائیں گی
یہ اشکوں کی فراوانی سے دھندلائی ہوئی آنکھیں

تری رعنائیوں کی تمکنت کو بھول جائیں گی
پکاریں گے تجھے تو لب کوئی لذّت نہ پائیں گے
گلو میں تیری الفت کے ترانے سوکھ جائیں گے
مبادا یادہائے عہدِ ماضی محو ہو جائیں
یہ پارینہ فسانے موجہائے غم میں کھو جائیں
مرے دل کی تہوں سے تیری صورت دُھل کے بہ جائے
حریمِ عشق کی شمعِ درخشاں بُجھ کے رہ جائے
مبادا اجنبی دُنیا کی ظلمت گھیر لے تجھ کو
مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو!

○

بعد از وقت

دل کو احساس سے دوچار نہ کر دینا تھا
سازِ خوابیدہ کو بیدار نہ کر دینا تھا
اپنے معصوم تبسّم کی فراوانی کو
وسعتِ دید پہ گلبار نہ کر دینا تھا
شوقِ مجبور کو بس ایک جھلک دکھلا کر
واقفِ لذّتِ تکرار نہ کر دینا تھا
چشمِ مشتاق کی خاموش تمناؤں کو
یک بیک مائلِ گفتار نہ کر دینا تھا
جلوۂ حسن کو مستور ہی رہنے دیتے
حسرتِ دل کو گنہگار نہ کر دینا تھا

○

سرودِ شبانہ

نیم شب، چاند، خود فراموشی
محفلِ ہست و بود ویراں ہے
پیکرِ التجا ہے خاموشی
بزمِ انجم فسردہ ساماں ہے
آبشارِ سکوت جاری ہے
چار سُو بے خودی سی طاری ہے
زندگی جزوِ خواب ہے گویا
ساری دُنیا سراب ہے گویا

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز

کہکشاں نیم وانگاہوں سے

کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز

سازِ دل کے خموش تاروں سے

چھن رہا ہے خمارِ کیف آگیں

آرزو، خواب، تیرا روئے حسیں

○

انتظار

گزر رہے ہیں شب و روز تم نہیں آتیں
ریاضِ زیست ہے آزردہ بہار ابھی
مرے خیال کی دُنیا ہے سوگوار ابھی

جو حسرتیں ترے غم کی کفیل ہیں پیاری
ابھی تلک مری تنہائیوں میں بستی ہیں

طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری
اُداس آنکھیں ابھی انتظار کرتی ہیں

بہارِ حسن، یہ پابندیٔ جفا کب تک؟
یہ آزمائشِ صبرِ گریز پا کب تک؟

قسم تمہاری بہت غم اُٹھا چکا ہوں میں
غلط تھا دعویٔ صبر و شکیب آ جاؤ
قرارِ خاطرِ بے تاب تھک گیا ہوں میں!

تہ نجوم

تہ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں
ہجومِ شوق سے اک دل ہے بے قرار ابھی
خمارِ خواب سے لبریز احمریں آنکھیں
سفید رُخ پہ پریشان عنبریں آنکھیں
چھلک رہی ہے جوانی ہر اک بُنِ مُو سے
رواں ہو برگِ گلِ تر سے جیسے سیلِ شمیم
ضیائے مہ میں دمکتا ہے رنگِ پیراہن
ادائے عجز سے آنچل اُڑا رہی ہے نسیم
دراز قد کی لچک سے گداز پیدا ہے
ادائے ناز سے رنگِ نیاز پیدا ہے

اداس آنکھوں میں خاموش التجائیں ہیں
دلِ حزیں میں کئی جاں بلب دعائیں ہیں
تہ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں
کسی کا حُسن ہے مصروفِ انتظار ابھی
کہیں خیال کے آباد کردہ گلشن میں
ہے ایک گل کہ ہے ناواقفِ بہار ابھی

حُسن اور موت

جو پھول سارے گلستاں میں سب سے اچھا ہو
فروغِ نور ہو جس سے فضائے رنگیں میں
خزاں کے جور و ستم کو نہ جس نے دیکھا ہو
بہار نے جسے خونِ جگر سے پالا ہو
وہ ایک پھول سماتا ہے چشمِ گلچیں میں

ہزار پھولوں سے آباد باغِ ہستی ہے
اجل کی آنکھ فقط ایک کو ترستی ہے
کئی دلوں کی امیدوں کا جو سہارا ہو
فضائے دہر کی آلودگی سے بالا ہو
جہاں میں آ کے ابھی جس نے کچھ نہ دیکھا ہو

نہ قحطِ عیش و مسرّت نہ غم کی ارزانی
کنارِ رحمتِ حق میں اُسے سُلاتی ہے
سکوتِ شب میں فرشتوں کی مرثیہ خوانی
طواف کرنے کو صبحِ بہار آتی ہے
صبا چڑھانے کو جنّت کے پھول لاتی ہے

تین منظر

تصوّر

شوخیاں مضطر نگاہِ دیدۂ سرشار میں
عشرتیں خوابیدہ رنگِ غازۂ رخسار میں
سُرخ ہونٹوں پر تبسّم کی ضیائیں جس طرح
یاسمن کے پھول ڈوبے ہوں مئے گلنار میں

سامنا

چھنتی ہوئی نظروں سے جذبات کی دُنیائیں
بے خوابیاں، افسانے، مہتاب، تمنّائیں
کچھ اُلجھی ہوئی باتیں، کچھ بہکے ہوئے نغمے
کچھ اشک، جو آنکھوں سے بے وجہ چھلک جائیں

رخصت

فسردہ رُخ، لبوں پر اک نیاز آمیز خاموشی
تبسّم مضمحل تھا، مرمریں ہاتھوں میں لرزش تھی
وہ کیسی بیکسی تھی تیری پُر تمکیں نگاہوں میں
وہ کیا دکھ تھا تری سہمی ہوئی خاموش آہوں میں

یاس

بربطِ دل کے تار ٹوٹ گئے!
ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل
مٹ گئے قصّہ ہائے فکر و عمل!
بزمِ ہستی کے جام پھوٹ گئے
چھن گیا کیفِ کوثر و تسنیم
زحمتِ گریۂ و بکا بے سود
شکوۂ بختِ نارسا بے سود
ہوچکا ختم رحمتوں کا نزول
بند ہے مدّتوں سے بابِ قبول
بے نیازِ دعا ہے ربِّ کریم

بجھ گئی شمعِ آرزوئے جمیل　　یاد باقی ہے بے کسی کی دلیل

انتظارِ فضول رہنے دے

رازِ الفت نباہنے والے

بارِ غم سے کراہنے والے

کاوشِ بے حصول رہنے دے

آج کی رات

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

دُکھ سے بھرپُور دن تمام ہوئے
اور کل کی خبر کسے معلوم؟
دوش و فردا کی مٹ چکی ہیں حدُود
ہو نہ ہو اب سحر کسے معلوم؟
زندگی ہیچ! لیکن آج کی رات؟
ایزدیّت ہے ممکن آج کی رات!
آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

اب نہ دُہرا، فسانہ ہائے الم
اپنی قسمت پہ سوگوار نہ ہو
فکرِ فردا اُتار دے دل سے
عمرِ رفتہ پہ اشکبار نہ ہو
عہدِ غم کی حکایتیں مت پوچھ
ہو چکیں سب شکایتیں مت پوچھ
آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

ایک رہگذر پر

وہ جس کی دید میں لاکھوں مسرّتیں پنہاں
وہ حُسن جس کی تمنا میں جنّتیں پنہاں

ہزار فتنے تہِ پائے ناز، خاک نشیں
ہر اک نگاہ خمارِ شباب سے رنگیں

شباب، جس سے تخیّل پہ بجلیاں برسیں
وقار، جس کی رفاقت کو شوخیاں ترسیں

ادائے لغزشِ پا پر قیامتیں قرباں
بیاضِ رُخ پہ سحر کی صباحتیں قرباں

سیاہ زلفوں میں وارفتہ نکہتوں کا ہجوم
طویل راتوں کی خوابیدہ راحتوں کا ہجوم

وہ آنکھ جس کے بناؤ پہ خالق اترائے
زبانِ شعر کو تعریف کرتے شرم آئے

وہ ہونٹ فیض سے جن کے بہار لالہ فروش
بہشت و کوثر و تسنیم و سلسبیل بدوش

گداز جسم، قبا جس پہ سج کے ناز کرے
دراز قد جسے سروِ سہی نماز کرے

غرض وہ حسن جو محتاجِ وصف و نام نہیں
وہ حُسن جس کا تصور بشر کا کام نہیں

کسی زمانے میں اس رہگذر سے گذرا تھا
بصد غرور و تجمل ادھر سے گذرا تھا

اور اب یہ راہگذر بھی ہے دلفریب و حسیں
ہے اس کی خاک میں کیفِ شراب و شعر مکیں

ہوا میں شوخیٔ رفتار کی ادائیں ہیں
فضا میں نرمیٔ گفتار کی صدائیں ہیں

غرض وہ حُسن اب اس جا کا جزوِ منظر ہے
نیازِ عشق کو اک سجدہ گہ میسّر ہے

○

ایک منظر

بام و در خامشی کے بوجھ سے چور — آسمانوں سے جوئے درد رواں
چاند کا دکھ بھرا فسانۂ نور — شاہراہوں کی خاک میں غلطاں

خواب گاہوں میں نیم تاریکی
مضمحل لے ربابِ ہستی کی — ہلکے ہلکے سُروں میں نوحہ کناں!

[illegible]

میرے ندیم...

خیال و شعر کی دنیا میں جان تھی جن سے
فضائے فکر و عمل ارغوان تھی جن سے
وہ جن کے نور سے شاداب تھے مہ و انجم
جنونِ عشق کی ہمت جوان تھی جن سے
وہ آرزوئیں کہاں سو گئی ہیں میرے ندیم؟

وہ ناصبور نگاہیں، وہ منتظر راہیں
وہ پاسِ ضبط سے دل میں دبی ہوئی آہیں
وہ انتظار کی راتیں، طویل، تیرہ و تار
وہ نیم خواب شبستاں، وہ مخملیں باہیں
کہانیاں تھیں، کہیں کھو گئی ہیں میرے ندیم!

مچل رہا ہے رگِ زندگی میں خونِ بہار
اُلجھ رہے ہیں پُرانے غموں سے رُوح کے تار
چلو، کہ چل کے چراغاں کریں دیارِ حبیب
ہیں انتظار میں اگلی محبّتوں کے مزار
محبّتیں جو فنا ہو گئی ہیں میرے ندیم!

○

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ!

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے؟
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یُوں ہو جائے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بُنوائے ہوئے

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنّوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجے؟
اب بھی دل کش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبّت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں، وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبّت مری محبوب نہ مانگ!

واپس لوٹ آئی ہے بہار

جاگ اُٹھیں سرسوں کی کرنیں ۔۔۔ واپس لوٹ آئی ہے بہار
پودے سنورے، سبزہ نکھرا ۔۔۔ دُھل گئے پھولوں کے رُخسار
واپس لوٹ آئی ہے بہار

سہمے سہمے افسردہ چہرے ۔۔۔ اُن پر غم کی گرد وہی
جور و ستم ویسے کے ویسے ۔۔۔ صدیوں کے دُکھ درد وہی
اور وہی برسوں کے بیمار
واپس لوٹ آئی ہے بہار

غم کے تپتے صحراؤں میں ۔۔۔ دُھندلی سی راحت کی چمک
یا بے جاں ہاتھوں سے ہٹ کر ۔۔۔ سمٹے سے آنچل کی جھلک
دل کی شکستوں کے انبار
واپس لوٹ آئی ہے بہار

سوچ

کیوں میرا دل شاد نہیں ہے — کیوں خاموش رہا کرتا ہوں؟
چھوڑو میری رام کہانی — میں جیسا بھی ہوں اچھا ہوں

میرا دل غمگیں ہے تو کیا — غمگیں یہ دُنیا ہے ساری
یہ دُکھ تیرا ہے نہ میرا — ہم سب کی جاگیر ہے پیاری

تو گر میری بھی ہو جائے — دُنیا کے غم یونہی رہیں گے
پاپ کے پھندے، ظلم کے بندھن — اپنے کہے سے کٹ نہ سکیں گے

غم ہر حالت میں مہلک ہے — اپنا ہو یا اور کسی کا
رونا دھونا، جی کو جلانا — یوں بھی ہمارا یوں بھی ہمارا

کیوں نہ جہاں کا غم اپنالیں بعد میں سب تدبیریں سوچیں
بعد میں سُکھ کے سپنے دیکھیں سپنوں کی تعبیریں سوچیں

بے فکرے دَھن دولت والے یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں؟
اِن کا سکھ آپس میں بانٹیں یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے سر پھوٹیں گے، خون بہے گا
خون میں غم بھی بہہ جائیں گے ہم نہ رہیں، غم بھی نہ رہے گا

رقیب سے

آکہ وابستہ ہیں اس حُسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا
جس کی اُلفت میں بُھلا رکھی تھی دُنیا ہم نے
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا

آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر
اس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے
کارواں گذرے ہیں جن سے اُسی رعنائی کے
جس کی ان آنکھوں نے بے سود عبادت کی ہے

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اُس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اُس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصوّر میں لُٹا دی ہم نے
تجھ پہ اُٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے؟
جُز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے، دُکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رُخِ زرد کے معنی سیکھے

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بیکس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں

ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
یا کوئی توند کا بڑھتا ہوا سیلاب لیے
فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لیے کہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں، کوئی نہیں!
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگذار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سُراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کِواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا!

چند روز اور مری جان!

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز
ظُلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم

جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی دَرد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر، کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بارِ ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد
دل کی بے سود تڑپ، جسم کی مایوس پکار
چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

○

مرگِ سوزِ محبت

آؤ کہ مرگِ سوزِ محبت منائیں ہم
آؤ کہ حسنِ ماہ سے دل کو جلائیں ہم

خوش ہوں فراقِ قامت و رخسارِ یار سے
سرو و گل و سمن سے نظر کو ستائیں ہم

ویرانیٔ حیات کو ویران تر کریں
لے ناصح آج تیرا کہا مان جائیں ہم

پھر اوٹ لے کے دامنِ ابرِ بہار کی
دل کو منائیں ہم کبھی آنسو بہائیں ہم

سلجھائیں بے دلی سے یہ الجھے ہوئے سوال
واں جائیں یا نہ جائیں، نہ جائیں کہ جائیں ہم

پھر دل کو پاسِ ضبط کی تلقین کر چکیں
اور امتحانِ ضبط سے پھر جی چرائیں ہم

آؤ کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق
اب ختم عاشقی کے فسانے سنائیں ہم

کُتّے

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتّے
کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی
زمانہ کی پھٹکار سرمایہ ان کا
جہاں بھر کی دُھتکار ان کی کمائی

نہ آرام شب کو، نہ راحت سویرے
غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو
ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو
یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے
یہ فاقوں سے اُکتا کے مر جانے والے

یہ مظلوم مخلوق گر سر اُٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں

کوئی ان کو احساسِ ذلّت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دُم ہلا دے

بول...

بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول، کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہنگر کی دُکاں میں
تند ہیں شعلے، سُرخ ہے آہن
کُھلنے لگے قُفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

اقبال

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دُھن میں غزلخواں گزر گیا
سُنسان راہیں خلق سے آباد ہوگئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اُس تک پہنچ سکیں
پر اُس کا گیت سب کے دلوں میں اُتر گیا
اب دُور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اُداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اُس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کی لَے سے سینکڑوں لذت شناس ہیں

موضوعِ سخن

گُل ہوئی جاتی ہے افسردہ، سُلگتی ہوئی شام
دُھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور ـــ مشتاق نگاہوں کی سُنی جائے گی
اور ـــ اُن ہاتھوں سے مَس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہات
اُن کا آنچل ہے، کہ رخسار، کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اُس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں؟

آج پھر حسنِ دلآرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر

اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال

اس کا وفور، اس کا خروش، اس کا سوز و ساز

یہ گیت مثلِ شعلۂ جوّالہ تند و تیز

اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز

جیسے چراغ، وحشتِ صرصر سے بے خطر

یا شمعِ بزم صبح کی آمد سے بے نیاز

○

رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غُبار
صندلی ہاتھ پہ دُھندلی سی حِنا کی تحریر

اپنے افکار کی، اشعار کی دُنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی، شاہدِ معنیٰ ہے یہی
آج تک سُرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوّا کی اولاد پہ کیا گزری ہے؟
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی، اَجداد پہ کیا گزری ہے

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟
یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لیے اِن میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے

یہ ہر اک سمت پُر اسرار کڑی دیواریں،
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اُس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اُس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے
اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

○

ہم لوگ

دل کے ایواں میں لیے، گل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہمے ہوئے اُکتائے ہوئے
حسنِ محبوب کے سیّال تصوّر کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے، لپٹائے ہوئے

غایتِ سُود و زیاں صورتِ آغاز و مآل
وہی بے سُود تجسّس، وہی بےکار سوال
مضمحل ساعتِ امروز کی بے رنگی سے
یادِ ماضی سے غمیں، دہشتِ فردا سے نڈھال
تشنہ افکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں
سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں

اک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں
اور اک الجھی ہوئی موہوم سی، درماں کی تلاش
دشت و زنداں کی ہوس، چاکِ گریباں کی تلاش

شاہراہ

ایک افسردہ شاہراہ ہے دراز
دُور اُفق پر نظر جمائے ہوئے
سرد مٹی پہ اپنے سینے کے
سُرمگیں حسن کو بچھائے ہوئے
جس طرح کوئی غمزدہ عورت
اپنے ویراں کدے میں محوِ خیال
وصلِ محبوب کے تصوّر میں
مُو بمُو چُور، عضو عضو نڈھال

○

غزلیں

جُنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے
صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دن ہے

طرب کی بزم ہے بدلو دِلوں کے پیراہن
جگر کے چاک سلاؤ کہ جشن کا دن ہے

تُنک مزاج ہے ساقی نہ رنگِ مے دیکھو
بھرے جو شیشہ، چڑھاؤ کہ جشن کا دن ہے

تمیزِ رہبر و رہزن کرو نہ آج کے دن
ہر اک سے ہاتھ ملاؤ کہ جشن کا دن ہے

ہے انتظارِ ملامت میں ناصحوں کا ہجوم
نظر سنبھال کے جاؤ کہ جشن کا دن ہے

بہت عزیز ہو لیکن شکستہ دل یارو
تم آج یاد نہ آؤ کہ جشن کا دن ہے

وہ شورشِ غمِ دل جس کی لَے نہیں کوئی
غزل کی دُھن میں سُناؤ کہ جشن کا دن ہے

(۸ مارچ ۱۹۵۷ء)

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے
تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے
دردِ شبِ ہجراں کی جزا کیوں نہیں دیتے
خونِ دلِ وحشی کا صلہ کیوں نہیں دیتے
مِٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اُٹھا کیوں نہیں دیتے
ہاں نکتہ ورو لاؤ لب و دل کی گواہی
ہاں نغمہ گرو، ساز، صدا کیوں نہیں دیتے
پیمانِ جُنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک
دل والو، گریباں کا پتا کیوں نہیں دیتے
بربادیٔ دل جبر نہیں فیضؔ کسی کا
وہ دُشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

لاہور جیل ۱۳ر دسمبر ۱۹۵ء

جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سرِ شام بجھ گئے ہیں

وہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں چراغِ رُخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں

بہت سنبھالا وفا کا پیماں مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے تمام پیغام بجھ گئے ہیں

قریب آ، اے مہِ شبِ غم، نظر پہ کھُلتا نہیں کچھ اس دم
کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے کون سے نام بجھ گئے ہیں

بہار اب آ کے کیا کرے گی کہ جن سے تھا جشنِ رنگ و نغمہ
وہ گُل سرِ شاخ جل گئے ہیں وہ دل تہِ دام بجھ گئے ہیں

○

یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم
ترا حُسن دستِ عیسیٰ، تری یاد رُوئے مریم

دل و جاں فدائے راہے کبھی آ کے دیکھ ہمدم
سرِ کوئے دلفگاراں شبِ آرزو کا عالم

تری دید سے سوا ہے ترے شوق میں بہاراں
وہ زمیں، جہاں گری ہے ترے گیسوؤں کی شبنم

یہ عجب قیامتیں ہیں تری رہگزر میں گزراں
نہ ہوا کہ مر مٹیں ہم، نہ ہوا کہ جی اُٹھیں ہم

لو سُنی گئی ہماری، یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے
وہی گوشۂ قفس ہے، وہی فصلِ گل کا ماتم

لاہور جیل۔ فروری ۱۹۵۹ء

تِرے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سرِ طلب، سرِ رہگزار چلے گئے

تری کج ادائی سے ہار کے شبِ انتظار چلی گئی
مرے ضبطِ حال سے رُوٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رُخِ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنہیں جُرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

جولائی ۱۹۵۹ء

○

کب ٹھہرے گا دردِ اے دل کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہوگی

کب جان لہو ہوگی، کب اشک گہُر ہوگا
کس دن تری شنوائی اے دیدۂ تر ہوگی

کب مہکے گی فصلِ گل کب بہکے گا مے خانہ
کب صبحِ سخن ہوگی کب شامِ نظر ہوگی

واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے نہ قاتل ہے،
اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہوگی

کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ
کب حشر معیّن ہے تجھکو تو خبر ہوگی

دسمبر ۱۹۵۹ء

آج یوں موج در موج غم تھم گیا اس طرح غمزدوں کو قرار آگیا
جیسے خوشبوئے زلفِ بہار آگئی جیسے پیغامِ دیدارِ یار آگیا

جس کی دید و طلب وہم سمجھے تھے ہم رُو برو پھر سرِ رہ گزار آگیا
صبحِ فردا کو پھر دل ترسنے لگا، عمرِ رفتہ ترا اعتبار آگیا

رُت بدلنے لگی رنگِ دل دیکھنا، رنگِ گلشن سے اب حال کھلتا نہیں
زخم چھلکا کوئی یا کوئی گل کھلا، اشک اُمڈے کہ ابرِ بہار آگیا

خونِ عشّاق سے جام بھرنے لگے، دل سلگنے لگے، داغ جلنے لگے
محفلِ درد پھر رنگ پر آگئی، پھر شبِ آرزو پر نکھار آگیا

سرفروشی کے انداز بدلے گئے، دعوتِ قتل پر مقتلِ شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آگیا، لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آگیا

فیضؔ کیا جانیے یار کس آس پر، منتظر ہیں کہ لائے گا کوئی خبر
مے کشوں پر ہُوا محتسب مہرباں، دل فگاروں پہ قاتل کو پیار آگیا

یک بیک شورشِ فغاں کی طرح
فصلِ گُل آئی امتحاں کی طرح

صحنِ گلشن میں بہرِ مشتاقاں
ہر روش کھنچ گئی کماں کی طرح

پھر لہو سے ہر ایک کاسۂ داغ
پُر ہوا جامِ ارغواں کی طرح

یاد آیا جنونِ گم گشتہ
بے طلب قرضِ دوستاں کی طرح

جانے کس پر ہو مہرباں قاتل
بے سبب مرگِ ناگہاں کی طرح

ہر صدا پر لگے ہیں کان یہاں
دل سنبھالے رہو زباں کی طرح

مئی ۱۹۶۲ء

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا

مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

اُدھر ایک حرف کہ کشتنی یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سُن کے اُڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

○

تری امید ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت نہ دن کو شب سے ہے

کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے

ہُوا ہے جب سے دلِ ناصبور بے قابو
کلام تجھ سے نظر کو بڑے ادب سے ہے

اگر شرر ہے تو بھڑکے، جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب تیرے رنگِ لب سے ہے

کہاں گئے شبِ فرقت کے جاگنے والے
ستارۂ سحری ہم کلام کب سے ہے

بمبئی ۱۹۵۷ء

○

ہر سمت پریشاں تری آمد کے قرینے
دھوکے دیئے کیا کیا ہمیں بادِ سحری نے

ہر منزلِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا
بہلایا ہے ہر گام بہت دربدری نے

تھے بزم میں سب دودِ سرِ بزم سے شاداں
بیکار جلایا ہمیں روشن نظری نے

مے خانے میں عاجز ہوئے آزردہ دلی سے
مسجد کا نہ رکھا ہمیں آشفتہ سری نے

یہ جامۂ صد چاک بدل لینے میں کیا تھا
مہلت ہی نہ دی فیضؔ کبھی بخیہ گری نے

لندن ۱۹۶۲ء

شرحِ فراق، مدحِ لبِ مشکبو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں

یار آشنا نہیں کوئی ٹکرائیں کس سے جام
کس دل رُبا کے نام پہ خالی سُبو کریں

سینے پہ ہاتھ ہے، نہ نظر کو تلاشِ بام
دل ساتھ دے تو آج غمِ آرزو کریں

کب تک سُنے گی رات، کہاں تک سنائیں ہم
شکوے گِلے سب آج ترے روبرو کریں

ہمدم حدیثِ کوئے ملامت سنائیو
دل کو لہو کریں کہ گریباں رفو کریں

آشفتہ سر ہیں، محتسبو، منہ نہ آئیو
سر بیچ دیں تو فکرِ دل و جاں عدو کریں

"تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں"

○

شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی
شُکر ہے زندگی تباہ نہ کی

تجھ کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے
تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی

تیرے دستِ ستم کا عجز نہیں
دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی

تھے شبِ ہجر، کام اور بہت
ہم نے فکرِ دلِ تباہ نہ کی

کون قاتل بچا ہے شہر میں فیضؔ
جس سے یاروں نے رسم و راہ نہ کی

منٹگمری جیل مارچ ۱۹۵۵ء

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سُرخرو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

اُٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

ہر اک قدم اجل تھا، ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

بادِ خزاں کا شکر کرو فیضؔ جس کے ہاتھ
نامے کسی بہار شمائل سے آئے ہیں

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا، خطائے نظر سے پہلے، عتاب، جرمِ سخن سے پہلے

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی، نہ منزل، فرازِ دار و رسن سے پہلے

نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خرد پہ دیوانہ پن سے پہلے

کرے کوئی تیغ کا نظارہ، اب ان کو یہ بھی نہیں گوارا
بضد ہے قاتل کہ جانِ بسمل فگار ہو جسم و تن سے پہلے

غرورِ سرو و سمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس والیٔ چمن تھے عروجِ سرو و سمن سے پہلے

اِدھر تقاضے ہیں مصلحت کے، اُدھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں، اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

حیدر آباد جیل ۱۷-۲۲ مئی ۱۹۵۴ء

○

شامِ فراق اب نہ پوچھ، آئی اور آکے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اُٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں ان کے سامنے بات بدل بدل گئی

آخرِ شب کے ہمسفر فیضؔ نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

جناح ہسپتال کراچی جولائی ۱۹۵۳ء

○

رہِ خزاں میں تلاشِ بہار کرتے رہے
شبِ سیہ سے طلب حسنِ یار کرتے رہے

خیالِ یار، کبھی ذکرِ یار کرتے رہے
اسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے

نہیں شکایتِ ہجراں کہ اس وسیلے سے
ہم ان سے رشتۂ دل استوار کرتے رہے

وہ دن کہ کوئی بھی جب وجہِ انتظار نہ تھی
ہم ان میں تیرا سوا انتظار کرتے رہے

ہم اپنے راز پہ نازاں تھے شرمسار نہ تھے
ہر ایک سے سخنِ رازدار کرتے رہے

ضیائے بزمِ جہاں بار بار ماند ہوئی
حدیثِ شعلہ رُخاں بار بار کرتے رہے

اُنھیں کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

جناح ہسپتال کراچی ۱۰ اگست ۱۹۵۳ء

○

بات بس سے نکل چلی ہے
دل کی حالت سنبھل چلی ہے

اب جنوں حد سے بڑھ چلا ہے
اب طبیعت بہل چلی ہے

اشک خوناب ہو چلے ہیں
غم کی رنگت بدل چلی ہے

یا یونہی بجھ رہی ہیں شمعیں
یا شبِ ہجر ٹل چلی ہے

لاکھ پیغام ہو گئے ہیں
جب صبا ایک پل چلی ہے

جاؤ اب سو رہو ستارو
درد کی رات ڈھل چلی ہے

منٹگمری جیل ۲۱ نومبر ۱۹۵۳ء

○

شاخ پر خونِ گل رواں ہے وہی
شوخیِ رنگِ گلستاں ہے وہی

سر وہی ہے تو آستاں ہے وہی
جاں وہی ہے تو جانِ جاں ہے وہی

اب جہاں مہرباں نہیں کوئی
کوچۂ یار مہرباں ہے وہی

برق سو بار گر کے خاک ہوئی
رونقِ خاکِ آشیاں ہے وہی

آج کی شب وصال کی شب ہے
دل سے ہر روز داستاں ہے وہی

چاند تارے اِدھر نہیں آتے
ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی

منٹگمری جیل

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

مشکل ہیں اگر حالات وہاں، دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

میدانِ وفا دربار نہیں یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

منٹگمری جیل

○

ہم پر تمہاری چاہ کا الزام ہی تو ہے
دشنام تو نہیں ہے، یہ اکرام ہی تو ہے

کرتے ہیں جس پہ طعن کوئی جرم تو نہیں
شوقِ فضول و الفتِ ناکام ہی تو ہے

دل مدعی کے حرفِ ملامت سے شاد ہے
اے جانِ جاں، یہ حرف ترا نام ہی تو ہے

دل نا اُمید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایّام ہی تو ہے

آخر تو ایک روز کرے گی نظر وفا
وہ یارِ خوش خصال سرِ بام ہی تو ہے

بھیگی ہے رات، فیضؔ غزل ابتدا کرو
وقتِ سرود، درد کا ہنگام ہی تو ہے

منٹگمری جیل ۹ مارچ ۵۴ء

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اُداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی تو صبح ترے کُنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقام، فیض! کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

منٹگمری جیل ۲۹ جنوری ۱۹۵۴ء

○

کچھ محتسبوں کی خلوت میں، کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ کشوں کے حصے کی، اب جام میں کم تر جاتی ہے

یوں عرض و طلب سے کب اے دل، پتھر دل پانی ہوتے ہیں
تم لاکھ رضا کی خو ڈالو، کب خوئے ستمگر جاتی ہے

بیدادگروں کی بستی ہے، یاں داد کہاں خیرات کہاں
سر پھوڑتی پھرتی ہے ناداں فریاد جو در در جاتی ہے

ہاں، جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجے
ہر رہ جو اُدھر کو جاتی ہے، مقتل سے گزر کر جاتی ہے

اب کوچۂ دلبر کا رہرو، رہزن بھی بنے تو بات بنے
پہرے سے عدو ٹلتے ہی نہیں اور رات برابر جاتی ہے

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

منٹگمری جیل، ۱۷ رجون ۱۹۵۴ء

گرمیٔ شوقِ نظارہ کا اثر تو دیکھو
گل کھلے جاتے ہیں وہ سایۂ در تو دیکھو

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو، پندگرو، راہ گزر تو دیکھو

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو

وہ جو اب چاک گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو کبھی ان کا جگر تو دیکھو

دامنِ درد کو گلزار بنا رکھا ہے
آؤ اک دن دلِ پُرخوں کا ہنر تو دیکھو

صبح کی طرح جھمکتا ہے شبِ غم کا افق
فیضؔ تابندگیٔ دیدۂ تر تو دیکھو

منٹگمری جیل ۴ر مارچ ۱۹۵۵ء

شہر میں چاک گریباں ہوئے ناپید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں ضبط کی تاکید اب کے

لطف کر، اے نگہِ یار، کہ غم والوں نے
آرزو کی بھی اُٹھائی نہیں تمہید اب کے

چاند دیکھا تری آنکھوں میں نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شبِ غم سے تری دید اب کے

دل دُکھا ہے نہ وہ پہلا سا، نہ جاں تڑپی ہے
ہم ہی غافل تھے، کہ آئی ہی نہیں عید اب کے

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی
لا کے رکھو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

کراچی ۱۴ر اگست ۱۹۵۵ء

O

یوں بہار آئی ہے اس بار کہ جیسے قاصد
کوچۂ یار سے بے نیلِ مرام آتا ہے
ہر کوئی شہر میں پھرتا ہے سلامت دامن
رند میخانے سے شائستہ خرام آتا ہے
ہوسِ مطرب و ساقی میں پریشاں اکثر
ابر آتا ہے کبھی ماہ تمام آتا ہے
شوق والوں کی حزیں محفلِ شب میں اب بھی
آمدِ صبح کی صورت ترا نام آتا ہے
اب بھی اعلان سحر کرتا ہوا مست کوئی
داغِ دل کر کے فروزاں سرِ شام آتا ہے

(ناتمام)

لاہور مارچ ۱۹۵۶ء

○

صبح کی آج جو رنگت ہے وہ پہلے تو نہ تھی
کیا خبر آج خراماں سرِ گلزار ہے کون

شام گلنار ہوئی جاتی ہے دیکھو تو سہی
یہ جو نکلا ہے لیے مشعلِ رُخسار ہے کون

رات مہکی ہوئی آئی ہے کہیں سے، پوچھو
آج بکھرائے ہوئے زلفِ طرحدار ہے کون

پھر درِ دل پہ کوئی دینے لگا ہے دستک
جانیے پھر دلِ وحشی کا طلبگار ہے کون

(نا تمام)

جناح ہسپتال کراچی، جولائی ۱۹۵۳ء

○

کبھی کبھی یاد میں اُبھرتے ہیں نقشِ ماضی مٹے مٹے سے
وہ آزمائشِ دل و نظر کی، وہ قربتیں سی، وہ فاصلے سے
کبھی کبھی آرزو کے صحرا میں آکے رکتے ہیں قافلے سے
وہ ساری باتیں لگاؤ کی سی، وہ سارے عُنواں وصال کے سے
نگاہ و دل کو قرار کیسا، نشاط و غم میں کمی کہاں کی،
وہ جب ملے ہیں تو اُن سے ہر بار کی ہے الفت نئے سرے سے
بہت گراں ہے یہ عیشِ تنہا، کہیں سبک تر کہیں گوارا
وہ دردِ پنہاں کہ ساری دنیا رفیق تھی جس کے واسطے سے
تمھیں کہو رند و محتسب میں ہے آج شب کون فرق ایسا
یہ آکے بیٹھے ہیں میکدے میں، وہ اُٹھ کے آئے ہیں میکدے سے

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیٔ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے

ہاں، تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں، اہلِ ستم، مشقِ ستم کرتے رہیں گے

منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سُرخیٔ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ اُن کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم، بہار کا موسم
گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم
ہے آزمائشِ حسنِ نگار کا موسم
خوشا نظارۂ رخسارِ یار کی ساعت
خوشا قرارِ دلِ بے قرار کا موسم
حدیث بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف
خرامِ ابرِ سرِ کوہسار کا موسم
نصیب صحبت یاراں نہیں، تو کیا کیجے
یہ رقصِ سایۂ سرو و چنار کا موسم
یہ دل کے داغ تو دُکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم

یہی جنوں کا، یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر، یہی اختیار کا موسم
قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم
صبا کی مست خرامی تہ کمند نہیں
اسیر دام نہیں ہے بہار کا موسم
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

نہ گُل کھلے ہیں، نہ اُن سے ملے، نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

○

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

حدیثِ یار کے عنواں اُبھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں

ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو، اَب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن
تو چشمِ صبح میں آنسو اُبھرنے لگتے ہیں

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق ولب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

درِ قفس پہ اندھیرے کی مُہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے اُترنے لگتے ہیں

○

شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام
شبِ فراق کے گیسو فضا میں لہرائے
کوئی پکارو کہ اک عمر ہونے آئی ہے
فلک کو قافلۂ روز و شام ٹھہرائے
یہ ضد ہے یادِ حریفانِ بادہ پیما کی!
کہ شب کو چاند نہ نکلے، نہ دن کو ابر آئے
صبا نے پھر درِ زنداں پہ آ کے دستک دی
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

(ناتمام)

○

عجزِ اہلِ ستم کی بات کرو　　عشق کے دم قدم کی بات کرو

بزمِ اہلِ طرب کو شرماؤ　　بزمِ اصحابِ غم کی بات کرو

بامِ ثروت کے خوش نشینوں سے　　عظمتِ چشمِ نم کی بات کرو

ہے وہی بات یوں بھی اور یوں بھی　　تم ستم، یا کرم کی بات کرو

خیر ہیں اہل دیر جیسے ہیں　　آپ اہلِ حرم کی بات کرو

ہجر کی شب تو کٹ ہی جائے گی　　روزِ وصلِ صنم کی بات کرو

جان جائیں گے جاننے والے
فیضؔ فرہاد و جم کی بات کرو

○

(نذرِ سودا)

فکرِ دلداریٔ گلزار کروں یا نہ کروں
"ذکرِ مُرغانِ گرفتار کروں یا نہ کروں"
قصّۂ سازشِ اغیار کہوں یا نہ کہوں
شکوۂ یارِ طرحدار کروں یا نہ کروں
جانے کیا وضع ہے اب رسمِ وفا کی اے دل
وضعِ دیرینہ پہ اصرار کروں یا نہ کروں
جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہلِ ہوس
مدحِ زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں
یُوں بہار آئی ہے امسال کہ گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں

گویا اس سوچ میں ہے دل میں لہو بھر کے گلاب
دامن و جیب کو گُلنار کروں یا نہ کروں

ہے فقط مرغ غزل خواں کہ جسے فکر نہیں
معتدل گرمئ گفتار کروں یا نہ کروں

○

گرانیٔ شبِ ہجراں دو چند کیا کرتے
علاجِ درد ترے درد مند کیا کرتے

وہیں لگی ہے جو نازک مقام تھے دل کے
یہ فرق دستِ عدو کے گزند کیا کرتے

جگہ جگہ پہ تھے ناصح تو کُو بکُو دلبر
اِنھیں پسند، اُنھیں ناپسند کیا کرتے

ہمیں نے روک لیا پنجۂ جُنوں ورنہ
ہمیں اسیر یہ کوتہ کمند کیا کرتے

جنھیں خبر تھی کہ شرطِ نواگری کیا ہے
وہ خوش نوا گلۂ قید و بند کیا کرتے

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سربلند، کیا کرتے

وہیں ہیں دل کے قرائن تمام کہتے ہیں
وہ اک خلش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں

تم آ رہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں
نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں

یہی کنارِ فلک کا سیہ تریں گوشہ
یہی ہے مطلعِ ماہِ تمام کہتے ہیں

پیو کہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید
گراں ہے اب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں

فقیہِ شہر سے مے کا جواز کیا پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

نوائے مرغ کو کہتے ہیں اب زیانِ چمن
کھلے نہ پھول اسے انتظام کہتے ہیں

کہو تو ہم بھی چلیں فیضؔ، اب نہیں سردار
وہ فرقِ مرتبۂ خاص و عام، کہتے ہیں

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

دوستو، اُس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے، نہ میخانے کا نام

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصوّر نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

(ق)

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رُو زُلف بکھرانے کا نام

اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

محتسب کی خیر، اُونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خُم کا، پیمانے کا نام

ہم سے کہتے ہیں چمن والے، غریبانِ چمن!
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

فیضؔ ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنھیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

دل میں اب یُوں ترے بھُولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں
ایک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں
رقصِ مے تیز کرو، ساز کی لے تیز کرو
سُوئے مے خانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں
کچھ ہمیں کو نہیں احسان اُٹھانے کا دماغ
وہ تو جب آتے ہیں، مائل بہ کرم آتے ہیں
اور کچھ دیر نہ گزرے، شبِ فرقت سے کہو
دل بھی کم دُکھتا ہے، وہ یاد بھی کم آتے ہیں

○

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
اب وہی دشمنِ دیں، راحتِ جاں ٹھہری ہے

ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گریزاں ناصح
گفتگو آج سرِ کوئے بتاں ٹھہری ہے

ہے وہی عارضِ لیلیٰ وہی شیریں کا دہن
نگہِ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے

وصل کی شب تھی تو کس درجہ سُبک گزری تھی
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے

اک دفعہ بکھری تو ہاتھ آئی ہے کب موجِ شمیم
دل سے نکلی ہے تو کیا لب پہ فغاں ٹھہری ہے

دستِ صیّاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بُلبُل کی زباں ٹھہری ہے

آتے آتے یونہی دم بھر کو رُکی ہوگی بہار
جاتے جاتے یونہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ، گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

○

آئے کچھ ابر، کچھ شراب آئے،
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

(ق)

بامِ مینا سے ماہتاب اُترے
دستِ ساقی میں آفتاب آئے
ہر رگِ خوں میں پھر چراغاں ہو
سامنے پھر وہ بے نقاب آئے

عمر کے ہر ورق پہ دل کی نظر
تیری مہر و وفا کے باب آئے

(ق)

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

نہ گئی تیرے غم کی سرداری
دل میں یوں روز انقلاب آئے

جل اُٹھے بزمِ غیر کے در و بام
جب بھی ہم خانماں خراب آئے

(ق)
اس طرح اپنی خامشی گونجی
گویا ہر سمت سے جواب آئے
فیضؔ تھی راہ سر بسر منزل
ہم جہاں پہنچے کامیاب آئے

○

(نذرِ غالب)

کسی گماں پہ توقع زیادہ رکھتے ہیں
پھر آج کُوئے بتاں کا ارادہ رکھتے ہیں

بہار آئے گی جب آئے گی، یہ شرط نہیں
کہ تشنہ کام رہیں گرچہ بادہ رکھتے ہیں

تری نظر کا گلہ کیا، جو ہے گلہ دل کو
تو ہم سے ہے کہ تمنا زیادہ رکھتے ہیں

نہیں شرابسے رنگیں تو غرقِ خوں ہیں کہ ہم
خیالِ وضعِ قمیص و لبادہ رکھتے ہیں

غمِ جہاں ہو، غمِ یار ہو کہ تیرِ ستم
جو آئے، آئے کہ ہم دل کُشادہ رکھتے ہیں

جوابِ واعظِ چابک زباں میں فیضؔ ہمیں
یہی بہت ہیں جو دو حرفِ سادہ رکھتے ہیں

○

تیری صورت جو دل نشیں کی ہے
آشنا شکل ہر حسیں کی ہے

حُسن سے دل لگا کے ہستی کی
ہر گھڑی ہم نے آتشیں کی ہے

صبحِ گُل ہو کہ شامِ مے خانہ
مدح اس رُوئے نازنیں کی ہے

شیخ سے بے ہراس ملتے ہیں
ہم نے توبہ ابھی نہیں کی ہے

ذکرِ دوزخ، بیانِ حُور و قصُور
بات گویا یہیں کہیں کی ہے

کیسے مانیں حرم کے سہل پسند
رسم جو عاشقوں کے دیں کی ہے

اشک تو کچھ بھی رنگ لا نہ سکے
خوں سے تر آج آستیں کی ہے

فیضؔ، اوجِ خیال سے ہم نے
آسماں سندھ کی زمیں کی ہے

یادِ غزال چشماں، ذکرِ سمن عذاراں
جب چاہا کر لیا ہے کُنجِ قفس بہاراں

آنکھوں میں درد مندی، ہونٹوں پہ عذر خواہی
جانانہ وار آئی شامِ فراقِ یاراں

ناموسِ جان و دل کی بازی لگی تھی ورنہ
آساں نہ تھی کچھ ایسی راہِ وفا شعاراں

مجرم ہو خواہ کوئی، رہتا ہے ناصحوں کا
رُوئے سخن ہمیشہ سوئے جگر فگاراں

ہے اب بھی وقت زاہد، ترمیمِ زُہد کر لے
سُوئے حرم چلا ہے انبوہِ بادہ خواراں

شاید قریب پہنچی صبحِ وصال ہمدم
موجِ صبا لیے ہے خوشبوئے خوش کناراں

ہے اپنی کشتِ ویراں سرسبز اس یقیں سے
آئیں گے اس طرف بھی اک روز ابرو باراں
آئے گی فیض اک دن بادِ بہار لے کر
تسنیمِ مے فروشاں، پیغامِ مے گساراں

قرضِ نگاہِ یار ادا کر چکے ہیں ہم
سب کچھ نثارِ راہِ وفا کر چکے ہیں ہم

کچھ امتحانِ دستِ جفا کر چکے ہیں ہم
کچھ ان کی دسترس کا پتا کر چکے ہیں ہم

اب احتیاط کی کوئی صورت نہیں رہی
قاتل سے رسم و راہ سوا کر چکے ہیں ہم

دیکھیں، ہے کون کون، ضرورت نہیں رہی
کوئے ستم میں سب کو خفا کر چکے ہیں ہم

اب اپنا اختیار ہے چاہیں جہاں چلیں
رہبر سے اپنی راہ جدا کر چکے ہیں ہم

ان کی نظر میں کیا کریں پھیکا ہے اب بھی رنگ
جتنا لہو تھا صرفِ قبا کر چکے ہیں ہم

کچھ اپنے دل کی خُو کا بھی شکرانہ چاہیے
سو بار ان کی خُو کا گلہ کر چکے ہیں ہم

○

وقفِ امیدِ دیدِ یار ہے دل
فصلِ گُل اور سوگوار ہے دل

جانتا ہے کہ وہ نہ آئیں گے
پھر بھی مصروف انتظار ہے دل

وجہِ رنج والم سہی لیکن
خوابِ الفت کی یادگار ہے دل

آپ ہی مجرمِ جفا نہ بنیں
ہم نے مانا گناہ گار ہے دل

فیضؔ انجامِ عاشقی معلوم
اس قدر ہے کہ بے قرار ہے دل

(ایک شعر)

ادائے حسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہ گارِ نظر کو حجاب آتا ہے

حُسن مرہونِ جوشِ بادۂ ناز
عشق منت کشِ فسونِ نیاز

دل کا ہر تار لرزشِ پیہم
جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز و گداز

سوزشِ دردِ دل کسے معلوم!
کون جانے کسی کے عشق کا راز!

تیری خاموشیوں میں لرزاں ہے
میرے نالوں کی گم شدہ آواز

ہو چکا عشق، اب ہوس ہی سہی
کیا کریں فرض ہے ادائے نماز

تو ہے اور اک تغافلِ پیہم
میں ہوں اور انتظارِ بے انداز

خوفِ ناکامیٔ اُمید ہے فیضؔ
ورنہ دل توڑ دے طلسمِ مجاز

○

عشق منت کشِ قرار نہیں　　حُسن مجبورِ انتظار نہیں

تیری رنجش کی انتہا معلوم!　　حسرتوں کا مری شمار نہیں

اپنی نظریں بکھیر دے ساقی　　مے باندازۂ خُمار نہیں

زیرِ لب ہے ابھی تبسم دوست　　منتشر جلوۂ بہار نہیں

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں　　ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

چارۂ انتظار کون کرے　　تیری نفرت بھی استوار نہیں

فیض زندہ رہیں وہ ہیں تو سہی
کیا ہوا گر وفا شعار نہیں

○

ہر حقیقت مجاز ہو جائے کافروں کی نماز ہو جائے

دل رہینِ نیاز ہو جائے بے کسی کارساز ہو جائے

منّتِ چارہ ساز کون کرے؟ درد جب جاں نواز ہو جائے

عشق دل میں رہے تو رسوا ہو لب پہ آئے تو راز ہو جائے

لطف کا انتظار کرتا ہوں جَور تا حدِّ ناز ہو جائے

عُمر بے سود کٹ رہی ہے فیضؔ
کاش افشائے راز ہو جائے

○

وہ عہدِ غم کی کاہشہائے بے حاصل کو کیا سمجھے
جو، اِن کی مختصر روداد بھی صبر آزما سمجھے

یہاں وابستگی واں برہمی، کیا جانیے کیوں ہے؟
نہ ہم اپنی نظر سمجھے نہ ہم ان کی ادا سمجھے

فریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے

تمہاری ہر نظر سے منسلک ہے رشتۂ ہستی
مگر یہ دور کی باتیں کوئی نادان کیا سمجھے!

نہ پوچھو عہدِ الفت کی، بس اک خوابِ پریشاں تھا
نہ دل کو راہ پر لائے نہ دل کا مدعا سمجھے

○

موت اپنی، نہ عمل اپنا، نہ جینا اپنا
کھو گیا شورشِ گیتی میں قرینہ اپنا

ناخدا دور، ہوا تیز، قریں کامِ نہنگ
وقت ہے پھینک دے لہروں میں سفینہ اپنا

عرصۂ دہر کے ہنگامے تہِ خواب سہی
گرم رکھ آتشِ پیکار سے سینہ اپنا

ساقیا رنج نہ کر جاگ اُٹھے گی محفل
اور کچھ دیر اٹھا رکھتے ہیں پینا اپنا

بیش قیمت ہیں یہ غمہائے محبت مت بھُول
ظلمتِ یاس کو مت سونپ خزینہ اپنا

○

ہمت التجا نہیں باقی
ضبط کا حوصلہ نہیں باقی
اک تری دید چھن گئی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی
اپنی مشقِ ستم سے ہاتھ نہ کھینچ
میں نہیں یا وفا نہیں باقی
تیری چشمِ الم نواز کی خیر
دل میں کوئی گلہ نہیں باقی
ہو چکا ختم عہدِ ہجر و وصال
زندگی میں مزا نہیں باقی

○

چشمِ میگوں ذرا اِدھر کر دے | دستِ قدرت کو بے اثر کر دے
تیز ہے آج دردِ دل ساقی | تلخیٔ مے کو تیز تر کر دے
جوشِ وحشت ہے تشنہ کام ابھی | چاکِ دامن کو تا جگر کر دے
میری قسمت سے کھیلنے والے | مجھ کو قسمت سے بے خبر کر دے
لٹ رہی ہے مری متاعِ نیاز | کاش وہ اس طرف نظر کر دے

فیضؔ، تکمیلِ آرزو معلوم
ہو سکے تو یونہی بسر کر دے

○

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے، کوئی شبِ غم گزار کے

ویراں ہے میکدہ، خُم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اِک فرصتِ گناہ ملی، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دُنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بھُولے سے مُسکرا تو دیئے تھے وہ آج فیض
مت پُوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

○

وفائے وعدہ نہیں، وعدۂ دِگر بھی نہیں
وہ مجھ سے روٹھے تو تھے، لیکن اس قدر بھی نہیں

برس رہی ہے حریمِ ہوس میں دولتِ حُسن
گدائے عشق کے کاسے میں اک نظر بھی نہیں

نہ جانے کس لیے اُمیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگذر بھی نہیں

نگاہِ شوق سرِ بزم بے حجاب نہ ہو
وہ بے خبر ہی سہی، اتنے بے خبر بھی نہیں

یہ عہدِ ترکِ محبّت ہے کس لیے آخر
سکونِ قلب اِدھر بھی نہیں اُدھر بھی نہیں

○

رازِ اُلفت چھپا کے دیکھ لیا
دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا

اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا

آس اِس در سے ٹوٹتی ہی نہیں
جا کے دیکھا، نہ جا کے دیکھ لیا

وہ مرے ہو کے بھی مرے نہ ہوئے
ان کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

آج اُن کی نظر میں کچھ ہم نے
سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا

فیض تکمیلِ غم بھی ہو نہ سکی
عِشق کو آزما کے دیکھ لیا

○

کچھ دن سے انتظار سوال دگر میں ہے
وہ مضمحل حیا جو کسی کی نظر میں ہے
سیکھی یہیں مرے دِل کافر نے بندگی
ربِّ کریم ہے تو تری رہگذر میں ہے
ماضی میں جو مزا مری شام و سحر میں تھا
اب وہ فقط تصوّرِ شام و سحر میں ہے
کیا جانے کس کو کس سے ہے اب داد کی طلب
وہ غم جو میرے دل میں ہے تیری نظر میں ہے

پھر حریفِ بہار ہو بیٹھے
جانے کس کس کو آج رو بیٹھے

تھی، مگر اتنی رائگاں بھی نہ تھی
آج کچھ زندگی سے کھو بیٹھے

تیرے در تک پہنچ کے لوٹ آئے
عشق کی آبرو ڈبو بیٹھے!

ساری دنیا سے دُور ہو جائے
جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے

نہ گئی تیری بے رُخی نہ گئی
ہم تری آرزو بھی کھو بیٹھے

فیضؔ ہوتا رہے جو ہونا ہے
شعر لکھتے رہا کرو بیٹھے

○

پھر لوٹا ہے خورشید جہاں تاب سفر سے
پھر نورِ سحر دست و گریباں ہے سحر سے

پھر آگ بھڑکنے لگی ہر سازِ طرب میں
پھر شعلے لپکنے لگے ہر دیدۂ تر سے

پھر نکلا ہے دیوانہ کوئی پھُونک کے گھر کو
کچھ کہتی ہے ہر راہ ہر اک راہگذر سے

وہ رنگ ہے امسال گلستاں کی فضا کا
اوجھل ہوئی دیوارِ قفس حدِّ نظر سے

ساغر تو کھنکتے ہیں شراب آئے نہ آئے
بادل تو گرجتے ہیں گھٹا برسے نہ برسے

پاپوش کی کیا فکر ہے، دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

کئی بار اس کی خاطر ذرّے ذرّے کا جگر چیرا
مگر یہ چشمِ حیراں جس کی حیرانی نہیں جاتی

نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی
متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی

مری چشمِ تن آساں کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

سرِ خسرو سے نازِ کج کلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

بجز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے؟
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

قطعے

یہ خون کی مہک ہے کہ لبِ یار کی خوشبو
کس راہ کی جانب سے صبا آتی ہے دیکھو
گلشن میں بہار آئی کہ زنداں ہوا آباد
کس سمت سے نغموں کی صدا آتی ہے دیکھو

میخانوں کی رونق ہیں، کبھی خانقہوں کی
اپنا لی ہوس والوں نے جو رسم چلی ہے
دلداریٔ واعظ کو ہمیں باقی ہیں، ورنہ
اب شہر میں ہر رندِ خرابات ولی ہے

○

کھلے جو ایک دریچے میں آج حُسن کے پھُول
تو صبح جھُوم کے گلزار ہو گئی یکسر
جہاں جہاں بھی گرا نور اُن نگاہوں سے
ہر ایک چیز طرحدار ہو گئی یکسر

رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں

آگ سلگاؤ آبگینوں میں

دلِ عشّاق کی خبر لینا

پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں

○

آج تنہائی کسی ہمدمِ دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ مہتاب اُبھرے
اور ترا عکس جھلکنے لگے ہر سائے تلے

نہ دید ہے نہ سخن اب نہ حرف ہے نہ پیام

کوئی بھی حیلۂ تسکین نہیں اور آس بہت ہے

امیدِ یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ

تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اُداس بہت ہے،

○

ہم خستہ تنوں سے محتسبو کیا مال منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں
دامن میں ہے مشتِ خاکِ جگر، ساغر میں ہے خونِ حسرتِ مے
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا، لو جام اُلٹائے دیتے ہیں

قلعہ لاہور۔ مارچ ۱۹۵۹ء

○

آ گئی فصلِ سکوں چاک گریباں والو
سِل گئے ہونٹ، کوئی زخم سِلے یا نہ سِلے
دوستو بزم سجاؤ کہ بہار آئی ہے
کھِل گئے زخم، کوئی پھُول کھِلے یا نہ کھِلے

اپریل ۵۹ء

ڈھلتی ہے موجِ مے کی طرح رات ان دِنوں

کِھلتی ہے صُبحِ گُل کی طرح رنگ و بُو سے پُر

ویراں ہیں جام پاس کرو کچھ بہار کا

دل آرزو سے پُر کرو، آنکھیں لہو سے پُر

اِن دنوں رسم و رہِ شہر نگاراں کیا ہے

قاصدا، قیمتِ گلگشتِ بہاراں کیا ہے

کوئے جاناں ہے کہ مقتل ہے کہ میخانہ ہے

آج کل صورتِ بربادیٔ یاراں کیا ہے

○

نہ آج لطف کر اتنا کہ کل گزر نہ سکے
وہ رات جو کہ ترے گیسوؤں کی رات نہیں

یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر ہمدم
"وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں"

فکرِ سود و زیاں تو چھوٹے گی

منتِ این و آں تو چھوٹے گی

خیر، دوزخ میں مے ملے نہ ملے

شیخ صاحب سے جاں تو چھوٹے گی

صبح پھوٹی تو آسماں پہ ترے
رنگِ رُخسار کی پھوار گری

رات چھائی تو رُوئے عالم پر
تیری زلفوں کی آبشار گری

○

تمام شب دلِ وحشی تلاش کرتا ہے
ہر اک صدا میں ترے حرفِ لطف کا آہنگ

ہر ایک صبح ملاتی ہے بار بار نظر
ترے دہن سے ہر اک لالہ و گلاب کا رنگ

حیدرآباد جیل ۱۵ مئی ۱۹۵۳ء

○

تمہارے حُسن سے رہتی ہے ہمکنار نظر

تمہاری یاد سے دل ہم کلام رہتا ہے

رہی فراغتِ ہجراں تو ہو رہے گا طے

تمہاری چاہ کا جو جو مقام رہتا ہے

حیدرآباد جیل ۱۵ر مئی ۱۹۵۳ء

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھدی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

نہ پُوچھ جب سے ترا انتظار کتنا ہے
کہ جن دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
ترا ہی عکس ہے ان اجنبی بہاروں میں
جو تیرے لب، ترے بازو، ترا کنار نہیں

صبا کے ہات میں نرمی ہے ان کے ہاتھوں کی
ٹھہر ٹھہر کے یہ ہوتا ہے آج دل کو گماں
وہ ہات ڈھونڈ رہے ہیں بساطِ محفل میں
کہ دل کے داغ کہاں ہیں، نشستِ درد کہاں

جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہلِ مصر، وضعِ تکلف تو دیکھیے

انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر
اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھیے

○

پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوانِ ہوس میں

بیٹھے ہیں ذوی العدل، گنہگار کھڑے ہیں

ہاں جرمِ وفا دیکھیے کس کس پہ ہے ثابت

وہ سارے خطاکار سرِ دار کھڑے ہیں

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اُٹھا ہوں
نکھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی
نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے
مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی
ہمیں سے سُنّتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گُل دامنی و کج کُلہی

○

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

دل رہینِ غمِ جہاں ہے آج

ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج

سخت ویراں ہے محفلِ ہستی

اے غمِ دوست! تو کہاں ہے آج؟

○

وقفِ حرمان و یاس رہتا ہے

دل ہے، اکثر اداس رہتا ہے

تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو

مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

○

فضائے دل پہ اُداسی بکھرتی جاتی ہے

فسردگی ہے کہ جاں تک اترتی جاتی ہے

فریبِ زیست سے قدرت کا مدّعا معلوم

یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے

چلے جب ادھر گلشتی کا دربار دیا

10